ذوالقعدہ ۱۴۴۱ھ۔ محرم الحرام ۱۴۴۲ھ
جولائی۔ ستمبر ۲۰۲۰ء

سہ ماہی حکمت قرآن لاہور

مؤسس: ڈاکٹر اسرار احمدؒ
مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

جدید تعلیم یافتہ حضرات وخواتین کے لیے دینی علوم کے حصول کا نادر موقع

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

جاری کردہ:
ڈاکٹر اسرار احمدؒ

رجوعِ الی القرآن کورس

(دورانیہ ۹ ماہ)

عرصہ 38 سال سے باقاعدگی سے جاری تعلیمی سلسلہ

مضامینِ تدریس

پارٹ ۱ (سالِ اوّل) برائے مرد وخواتین

- تجوید و ناظرہ
- عربی گرائمر (صرف ونحو)
- ترجمہ قرآن (مع تفسیری ولُغوی توضیحات)
- دورہ ترجمہ قرآن
- قرآن حکیم کی فکری وعملی رہنمائی
- سیرت وشمائل النبی صلی اللہ علیہ وسلم
- مطالعہِ حدیث واصطلاحاتِ حدیث
- فکرِ اقبال
- فقہ العبادات
- معاشیاتِ اسلام
- اضافی محاضرات

پارٹ ۲ (سال دوم) برائے مرد حضرات

- عربی زبان وادب
- اصولِ تفسیر
- تفسیر القرآن
- اصولِ حدیث
- درسِ حدیث
- اصول الفقہ
- فقہ المعاملات
- عقیدہ (طحاویہ)
- اضافی محاضرات

آغازِ تدریس: 15 ستمبر سے (اِن شاءاللہ)
10 اگست 2020ء سے رجسٹریشن کا آغاز ہو چکا ہے۔

ایامِ تدریس پیر تا جمعہ

نوٹ: بیرونِ لاہور رہائشی حضرات کے لیے ہاسٹل کی محدود سہولت پہلے آیئے پہلے پایئے کی بنیاد پر موجود ہے۔

اوقاتِ تدریس:
صبح 8 بجے تا 12:30

ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی خدماتِ قرآنی کا مرکز —— قرآن اکیڈمی

K-36 ماڈل ٹاؤن لاہور
email:irts@tanzeem.org
www.tanzeem.org

زیرِ انتظام مرکزی انجمن خدّامُ القرآن لاہور (رجسٹرڈ)

مزید تفصیلات کے لئے www.tanzeem.org
03161466611 - 04235869501-3

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا (البقرۃ: ۲۶۹)

سہ ماہی حکمت قرآن لاہور

جلد ۳۹ شمارہ ۳

ذوالقعدہ ۱۴۴۱ھ۔ محرم الحرام ۱۴۴۲ھ جولائی۔ستمبر ۲۰۲۰ء

بیاد:

ڈاکٹر محمد رفیع الدین ۔ ڈاکٹر اسرار احمد رحمہما اللہ

مدیر مسئول: ڈاکٹر ابصار احمد

مُدیر: حافظ عاطف وحید

نائب مُدیر:
حافظ خالد محمود خضر

ادارۂ تحریر:
ڈاکٹر حافظ محمد زبیر۔ مؤمن محمود
پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

یکے از مطبوعات
مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36 کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون 3-35869501

ویب سائٹ : www.tanzeem.org

ای میل: publications@tanzeem.org

سالانہ زرِتعاون: 280 روپے، فی شمارہ: 70 روپے

اِس شمارے میں

حرفِ اوّل

خداشناس تہذیب کی بازیافت کیسے؟	ڈاکٹر ابصار احمد	3

تذکّر و تدبّر

مِلاکُ التأویل (۲۲)	ابوجعفر احمد بن ابراہیم الغرناطی	18

فہمُ القرآن

ترجمۂ قرآن مجید، مع صرفی ونحوی تشریح	افاداتِ حافظ احمد یارؒ	31

احسانِ اسلام

اقوالِ حسن بصریؒ	محمد رشید ارشد	45

افکار و آراء

سماج اور مذہب کا ربط و تعلق	اویس شوکت چیمہ۔ ڈاکٹر محمد امین	60

فکر و نظر

یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ (۲)	پروفیسر حافظ احمد یارؒ	65

بیانُ القرآن

MESSAGE OF THE QURAN	Dr. Israr Ahmad	96

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خداشناس تہذیب کی بازیافت کیسے؟

ڈاکٹر ابصار احمد

قارئین راقم سے اتفاق کریں گے کہ فی زمانہ زبان کھولنے اور قلم چلانے کے مواقع بہت زیادہ ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ گفتگو اور لکھنے لکھانے کے اوضاع بھی اب بدل چکے ہیں۔ قلم و قرطاس کی جگہ لیپ ٹاپ اور کی بورڈ نے لے لی ہے جس پر انگلیاں حرکت کرتی ہیں اور سکرین پر عبارت کمپوز ہو جاتی ہے اور ایک کلک سے وہ سائبر سپیس میں پہنچ کر ناظرین اور قارئین تک منتقل ہو جاتی ہے۔ بولنے اور تصویر کا معاملہ بھی کچھ عرصہ قبل تک منبر یا سٹیج سے ہوتا تھا جبکہ اب ہر نام نہاد واعظ اور عالم ایک کمرے میں سمارٹ فون کے کیمرے کے سامنے بیٹھ کر اپنی ہر طرح کی لغویات، ہفوات اور سطحیات پر مبنی آراء کا اظہار کر کے سوشل میڈیا یا واٹس ایپ پر اپ لوڈ کرتا ہے اور ہزاروں دیکھنے اور سننے والوں کے اذہان کو زہر آلودہ کر دیتا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اب ہر موضوع پر آن لائن نگارشات اور پوری پوری کتب PDF فارم میں اتنی وافر مقدار میں موجود ہیں کہ ذہن آخری زمانے کے فتنوں کے ذکر کی احادیث میں وارد ''نشر القلم'' اور ''فشو القلم'' کے الفاظ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، یعنی جن میں تصنیفات اور جرائد کے کثیر تعداد میں شائع ہونے کا اشارہ ہے جو ہر طرح کے رطب و یابس سے بھرپور ہوں گے۔ اس scenario میں مقرر، داعی اور قلمکار کی legitimacy کی تعیین سے قطعاً صرفِ نظر کر لیا جاتا ہے کہ آیا وہ صاحب/صاحبہ پیش کیے گئے موضوع پر بولنے یا لکھنے کی اہلیت بھی رکھتے ہیں یا نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ بے شمار کج فہم، بدعقیدہ اور ناپختہ اذہان صرف خطابت، چرب زبانی اور اداکاری کے زور پر لوگوں کے دین و ایمان کے ساتھ کھلواڑ کر رہے ہیں۔

پاکستانی نژاد برٹش دانشور ضیاء الدین سردار کے بقول ہم سب عالمی سطح پر Post-Normal era میں جی رہے ہیں، جن میں مسائل اور فکری ایشوز کے ضمن میں وہ 'C' سے شروع ہونے والے تین الفاظ complexity، chaos اور contradictions کو خاص طور پر نمایاں کرتا ہے، اور اس میں شک نہیں کہ جملہ مباحث و مسائل اب از حد تہہ در تہہ اور گھمبیر ہوتے جا رہے ہیں۔ انتشارِ فکری اور متخاصم و متضاد بیانیے اور positions ایک دوسرے کے مقابل پڑھنے اور سننے میں آتی ہیں، اور اس صورت حال میں خاصا پڑھا لکھا انسان بھی حیرت و استعجاب سے سر پکڑ کر رہ جاتا ہے۔ اتہامات، الزامات اور جوابی الزامات سے سوشل میڈیا پر آنے والی تحریریں اور اردو/انگریزی دونوں اخبارات کے کالم اور ایڈیٹوریل شذرات بھی ژولیدہ فکری اور سطحیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔

اس صدی کے آغاز اور بالخصوص اس کی دوسری دہائی میں اسلام مخالف سیکولر مغربی فکر و کلچر نے اپنے مقامی ایجنٹوں کے تعاون سے پاکستانی معاشرے اور سماج میں نفوذ کے کچھ نئے ڈھنگ بھی اختیار کیے ہیں‘ جن کا شعور مؤقر اخبارات کے فہیم قاری بآسانی حاصل کر سکتے ہیں۔ ان میں اہم ترین ادب اور لٹریچر کے حوالے سے فیسٹیولز کا انعقاد ہے‘ جو پاکستان کے پانچ چھ اہم اور بڑے شہروں میں مؤثر پبلسٹی کے ساتھ بہت اہتمام سے منعقد کیے جاتے ہیں۔ ایلیٹ کلاس کی دلچسپی اور شرکت کے لیے ان میں تین چار یونیورسٹی پروفیسرز اور دانشور مصنفین غیر ممالک سے بھی مدعو کیے جاتے ہیں۔ فیسٹیولز بالعموم دو سے تین دن تک جاری رہتے ہیں اور ان میں داخلہ تمام شہریوں (مرد و خواتین) کے لیے کھلا اور بلاٹکٹ ہوتا ہے۔ کچھ میلے اور اکٹھ مخصوص اشخاص سے منسوب کر کے منعقد کیے جاتے ہیں‘ جس کی ایک اہم مثال فیض امن میلہ ہے۔ جبکہ کچھ علاقائی زبانوں کے حوالے سے برپا کیے جاتے ہیں‘ جن میں مقامی زبانوں کے ادبی شہ پاروں کے تعارف اور تبصروں کے ساتھ ساتھ کلچرل شوز بھی لوگوں کی دلچسپی کا باعث بنتے ہیں۔ موضوعات کی کثرت و تنوع کی وجہ سے مقررین و باحثین کو ایک ہی وقت میں کئی سماعت گاہوں میں بٹھایا جاتا ہے اور سامعین شرکاء اپنے ذوق کے مطابق مخصوص محافل میں بیٹھ کر گفتگو سنتے ہیں۔ اور بعد ازاں سوال و جواب کے لیے بھی وقت دیا جاتا ہے۔ ان فیسٹیولز میں پیش کیے گئے خیالات اور بحث و تمحیص کا تذکرہ دو تین ہفتوں تک اخبارات میں جگہ پاتا ہے اور اس طرح ان کی خوب تشہیر ہوتی ہے۔ چونکہ ان فیسٹیولز کی انتظامیہ کو ملکی متمول اداروں مثلاً بینکوں اور تجارتی کمپنیوں‘ NGOs اور مغربی ممالک سے فنڈنگ کی جاتی ہے‘ اس لیے یہ ان کے ایجنڈے کے مطابق سیکولر اور لبرل خیالات کو پروموٹ کرتے ہوئے‘ اسلام‘ نظریہ پاکستان اور برصغیر میں مسلمانوں کی تاریخ کو خوب رگیدتے ہیں۔ ادب اور لٹریچر فیسٹیولز بعض غیر ملکی ایجنٹوں اور ملٹی نیشنل تجارتی کمپنیز کے تعاون سے اب پاکستان سے باہر مثلاً لندن‘ نیویارک اور دوسرے بڑے شہروں میں بھی ہونے لگے ہیں‘ تاکہ پاکستان کا ''soft image'' ان مغربی ممالک میں بھی پیش کیا جائے۔ ایک گروپ نے مختلف انداز اختیار کرتے ہوئے اس قسم کے سنگت کو thinkfest کے نام سے بھی کراچی اور لاہور میں منعقد کیا ہے‘ جہاں 'افکارِ تازہ' کا سلوگن اپنی جدیدیت پسندی کے اظہار کے لیے نمایاں کیا جاتا ہے۔

دین دشمن سیکولر لبرل خیالات و افکار کے شیوع کا عمل برسوں سے یعنی پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے جلد بعد ہی شروع ہو گیا۔ وطن عزیز کی یونیورسٹیوں اور اعلیٰ تحقیقاتی اداروں میں سیکولر مغربی فکر و کلچر سے متأثر اساتذہ کا عمل دخل اور خاص طور پر تعلیمی و تدریسی سیٹ اپ میں طلبہ و طالبات کے اذہان میں تشکیک اور مذہب مخالف نقطۂ نظر پیدا کرنے میں کچھ پروفیسر خواتین و حضرات کا رول از حد افسوسناک رہا ہے۔ دینی مسلّمات اور یقینیات میں رخنہ اندازی دھیمے اور خوشگوار لہجے کے ذریعے شیریں زہر چکانی اور تشکیک آفرینی ان پروفیسروں کے مخصوص ہتھیار ہیں۔ وہ برملا اپنے مادہ پرستانہ تصورِ حیات اور اسلام دشمنی کا نہ صرف اظہار کرتے ہیں بلکہ مذہبی لوگوں پر طعن و تشنیع کے تیر بھی برساتے ہیں۔ تعلیمی اداروں سے باہر ذہین اور پڑھے لکھے لوگوں پر بھی یہ حضرات و

خواتین اپنے مضامین (جو اکثر و بیشتر موقر انگریزی روزناموں اور ہفت روزہ جرائد میں شائع ہوتے ہیں) کے ذریعے اثر انداز ہوتے ہیں۔ فزکس کے معروف پروفیسر جو حال ہی میں ایف سی کالج یونیورسٹی سے فارغ کیے گئے ہیں' مذہبی ایمان و ایقان اور اسلامی فرائض و شعائر کی پابندی کرنے والے افراد کے لیے تمسخر کے انداز میں روزنامہ Dawn کے ایک کالم میں یہ الفاظ استعمال کرتے ہیں:

'feverishly preparing for travel to the hereafter'

ایک صادق الایمان' پابندِ صوم وصلوٰۃ اور اخلاق و عمل میں قرآن وسنّت کے اوامر پر عمل کرنے والے شخص کے رویّے کی ایک اعتبار سے یہ انتہائی بھونڈی اور تضحیک آمیز تعبیر ہے۔ اگرچہ فی الحقیقت ایک صاحبِ ایمان اور آخرت میں محاسبۂ اُخروی پر گہرا ایقان رکھنے والے اور حدود آشنا زندگی بسر کرنے والے شخص کے اعمال و کردار کی صحیح آئینہ دار بھی ہے' جو اصل اور دائمی زندگی موت کے بعد کی زندگی کو مانتا ہے اور اپنے ہر عمل میں آخرت کے اجر اور فلاح کو سامنے رکھتا ہے۔ جبکہ ایک الحادزدہ ذہن اس perspective ہی سے محروم ہے۔ اس کی کُل دلچسپی لمحۂ موجود کے مسائل اور محدود احوال وظروف سے ہوتی ہے۔ ایمانی قطعیات سے محروم یہ صرف ظنّیات میں ٹامک ٹوئیاں مارنے ہی میں مست رہتا ہے' بفحوائے آیتِ قرآنیہ ﴿اَلَّذِیْنَ هُمْ فِیْ خَوْضٍ یَّلْعَبُوْنَ ﴿۱۲﴾﴾ (الطور) (یعنی یہ لوگ اپنی خام خیالی اور نیم عقلی توجیہات اور خیالات ہی میں شاداں وفرحاں رہتے ہیں)۔ اپنے مبدأ اور معاد سے بالکل بے خبر وہ اس دارِفنا کی لذّات ہی کو اپنا مقصدِ حیات بنائے ہوئے ہیں اور اپنے تئیں اپنی مساعی اور بھاگ دوڑ کو بڑی کامیابی سمجھتے ہیں اور از روئے قرآن شیطان ان کی تگ وتاز کو خوب مزیّن اور خوشنما بنا دیتا ہے۔ چنانچہ کامیابی و کامرانی کے سارے معیار ان کے نزدیک دنیاوی مال و دولت اور آرام و آسائش سے متعلق ہیں۔

اسی قبیل کے ایک اور دانشور' جو درحقیقت تاریخ کے پروفیسر اور فیکلٹی ڈین رہے ہیں اور ایک پبلک یونیورسٹی سے ریٹائرمنٹ کے بعد ایک دوسری پرائیویٹ یونیورسٹی میں اسی عہدے پر ہیں' ہر ہفتے انگریزی اخبار The News میں خاصا طویل کالم لکھتے ہیں۔ موصوف ہر قسم کی Binary-division کے از حد خلاف ہیں یعنی ان کے نزدیک حق اور باطل کے درمیان فرق و امتیاز ناروا ہے۔ اسی فکر کا ایک ضمنی نتیجہ (coroallary) ہے جو انہوں نے گزشتہ ماہ اپنے کالم میں بایں انداز ارشاد فرمایا کہ ہمیں اپنے سے مختلف نظریہ اور اندازِ فکر رکھنے والوں پر تنقید تو کرنی چاہیے لیکن انہیں condemn نہیں کرنا چاہیے۔ یہ سوچ اس بات کی غماز ہے کہ انہوں نے سورۃ الفاتحہ میں وارد ''مَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ'' اور بنی اسرائیل کے بارے میں قرآنی تصریحات پر کبھی غور نہیں کیا جہاں انہیں مغضوب وملعون (رحمتِ خداوندی سے محروم) اور ذلّت اور مسکنت کا سزاوار قرار دیا گیا۔ اور یہ سخت ترین condemnation نہیں تو اور کیا ہے؟ استعمار آفریدہ تعلیم اور جدیدیت گزیدہ علمی فضا میں پروان پڑھنے والے دانشوروں سے ایسی ہی گلفشانی متوقع ہے۔ حیرت ہے کہ سوشل سائنسز کے ڈین اور علم تاریخ کے 'مسلمان'

پروفیسر ہونے کے باوجود وہ اسلامی عقائد اور قرآن کریم کی بیان کردہ پچھلی اُمتوں کی تاریخ سے اتنے نابلد ہیں کہ نقد وتبصرہ اور ملامت و مذمت میں فرق نہیں کر پا رہے‘ جبکہ ملامت وسرزنش محض نقد وجرح سے یقیناً آگے کا عمل ہے جو خالق کائنات کی طرف سے بنی اسرائیل پر کیا گیا۔ اور بحیثیت مسلمان ہمارے لیے اس پر جُزبُز ہونے کی کوئی گنجائش نہیں ہے‘ بلکہ اسے بہرصورت تسلیم کرنا ہے۔ اور ہمارا یہ رویّہ تمام اَعدائے دین وملّت کے لیے ہونا چاہیے۔

تحریک آزادیٔ نسواں (Feminism) سے متأثر ایک معروف نجی یونیورسٹی کے سابق ڈین سوشل سائنسز فیکلٹی جن الفاظ میں مارچ میں منائے گئے ’خواتین مارچ‘ میں کی گئی بیہودگیوں اور فحاشی کو سراہتے ہیں وہ انتہائی افسوسناک اور ہمارے سماج میں ایک کلچروار کی نشاندہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کلچروار پورے عالم میں برپا ہے۔ ایک اہم مصنف جیمز ڈیولین ہنٹر نے امریکہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہاں بھی کلچرل سپلٹ ہے‘ یعنی ایک امریکہ کا لبرل سائیڈ ہے اور دوسرا بالکل مختلف کنزرویٹو سائیڈ ہے۔ ہمارے ہاں بھی اس کے اثرات پہنچے ہیں۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ یہ پروفیسر صاحب اور بیبیوں دوسرے صنفی تقسیم کو قرآن کے پیش کردہ بیانیے میں دیکھنے کی بجائے (جس میں مرد اور عورت کا تعلق تضاد اور مخاصمت (antagonism) کا نہیں بلکہ بنیادی طور پر complementarity کا ہے) مغرب کے لبرلزم اور مرد وزن کی کامل مساوات اور عورتوں کے حقوق اور مکمل آزادی کے مؤید بن کر سامنے آتے ہیں۔ اور نہ صرف وہاں اپنے موقف کا اظہار کرتے ہیں بلکہ اس کلچروار میں فریق مخالف یعنی اسلامیین (Islamists) کی شکست کا اعلان بھی کرتے ہیں‘ کیونکہ وہ بزعم خویش وقت اور تاریخ کے دھارے کا رُخ اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں دیکھتے ہیں جبکہ مذہبی عناصر ہزیمت سے دوچار ہوں گے۔ معلوم نہیں انہیں مستقبل کے بارے میں یہ علم کیسے حاصل ہوا:

They are fighting a reargaurd action because the arc of history has been bending towards gender equality.

یہاں راقم حکمت قرآن بابت اپریل جون ۲۰۲۰ء یعنی گزشتہ سہ ماہی میں اسی موضوع پر شائع شدہ ایک مفصل مضمون سے چند سطور پیش کر رہا ہے جو اس مسئلے پر ہمارے دینی تصورات کی روشنی میں ایک معتدل تصوّر پیش کرتا ہے‘ اور مصنف کی وسعتِ نظر اور تعمق کی عمدہ مثال ہے:

> ’’بہرحال یہ اس context میں گفتگو ہو رہی ہے کہ دو طبقات بن گئے ہیں۔ ایک عورتوں کے حقوق کے علمبردار بن کے کھڑے ہو گئے اور بدقسمتی یہ ہے کہ انہوں نے دینی شعائر اور اخلاق کے حوالے سے ایک بہت غلط رویہ اختیار کیا ہے۔ دوسری طرف اہل مذہب ہیں‘ ان پر ایک الزام ہے کہ یہ عورتوں پر ظلم کرتے ہیں‘ زیادتی کرتے ہیں‘ یا عورتوں پر ظلم وزیادتی کی حمایت کرتے ہیں‘ یا کم از کم اس زیادتی پر نکیر نہیں کرتے۔ یہ الزام زیادہ تر تو غلط ہیں‘ لیکن ان میں کچھ نہ کچھ صداقت بھی ہے۔ چنانچہ ہمیں اس قرآنی ہدایت کو سامنے رکھتے ہوئے عورتوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے عدل وانصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔‘‘

زیرِنظر شمارے میں ''افکار و آراء'' کے تحت جاوید احمد غامدی صاحب کے ایک تلمیذ کے اخلاق اور اسلامی اقدار کے حوالے سے افکارِ جدیدہ کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ پروفیسر اویس شوکت چیمہ نے علمی استدلال کے ذریعے سماجی ارتقاء اور آسمانی تعلیمات میں کامل ہم آہنگی دکھاتے ہوئے جناب خورشید ندیم کے خیالات پر نقد کی ہے جو فہمِ دین کے نئے اصول قائم کر کے اسلام کو discover یا reunderstand کرنا چاہتے ہیں' یا بالفاظِ دیگر روایتی و متوارث فہم دین کی جگہ ہیومنزم سے متأثر نئی تعبیرات لانا چاہتے ہیں' اور اس طرح قرآن کریم کی تصریح ''فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ'' (المؤمن: ۸۳) کا مصداق ہیں۔

سطور بالا میں بیان کردہ تشکیک اور مغربی ملحدانہ افکار اور ثقافتی اثرات کی بیخ کنی اور تردید کے لیے موسس انجمن خدام القرآن برادر محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے اپنی زندگی کے کم و بیش ساٹھ سال صرف کیے اور اس کے لیے ''رجوع الی القرآن'' کا بلند آہنگ آوازہ مشرق و مغرب میں دروسِ قرآن کے ذریعے انتہائی شدید محنت و مشقت اور جذبہ و استقلال کے ساتھ بلند کیا۔ ان کے دروس اور خطابات کی ویڈیوز اور شارٹ ویڈیو کلپس اب بھی (ان کے دارِ فانی سے دارِ بقا کی طرف کوچ کرنے کے دس سال بعد) سمارٹ موبائل کی سکرین پر بڑی تعداد میں لوگ دیکھ اور سن رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب بلاشبہ وسیع النظر اور صاحبِ بصیرت داعی تھے جن کی نظر عالمی احوال و ظروف اور سیاسی و ثقافتی تبدیلیوں پر گہری تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دروسِ قرآن اور تقاریر کے دوران سامعین ہمہ تن گوش اور میسمرائز ڈ نظر آتے تھے۔ انہیں دعوت و تبلیغ کے عصر حاضر کے اساطین میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو کلامِ پاک سے تعلق کے ضمن میں روحانی طمانیت' ذہنی مناسبت اور باطنی نشاط سے اس قدر بہرۂ وافر عطا ہوا تھا کہ بڑھاپے اور شکستگی کے باوجود انتقال سے صرف دو روز قبل انہوں نے فیصل آباد میں رفقائے تنظیم اسلامی سے نہایت رِقّت آمیز گفتگو کی اور وہ ان کا الوداعی خطاب ثابت ہوا۔

بانیٔ تنظیم و انجمن خدام القرآن ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے اپنے مطالعہ قرآن کریم کی روشنی میں واضح کیا کہ اللہ تعالیٰ نے فرائضِ نبوت کے ضمن میں تین مقامات پر تزکیہ کا ذکر تعلیمِ کتاب و حکمت سے پہلے کیا۔ اس سے استشہاد کرتے ہوئے انہوں نے بارہا لوگوں کی توجہ اس حقیقت کی جانب مبذول کرائی کہ تزکیہ نفس کے بغیر دین میں ترقی اور احیائے اسلام کی جدّ و جُہد میں اس کی اصل روح برقرار نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ انہوں نے اپنی اُس تحریر میں' جو مرکزی انجمن خُدّام القرآن کی تاسیس کا باعث بنی' وضاحت کے ساتھ اور بصراحت تحریر کیا:

> ''عوام کی کشت قلوب میں ایمان کی تخم ریزی اور آبیاری کا مؤثر ترین ذریعہ ایسے اصحابِ علم و عمل کی صحبت ہے جن کے قلوب و اذہان معرفتِ ربانی و نورِ ایمانی سے منور' سینے کبر' حسد' بغض اور ریا سے پاک اور زندگیاں حرص' طمع' لالچ اور حُبِّ دنیا سے خالی نظر آئیں۔ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے نظام کے درہم برہم ہو جانے کے بعد ایسے ہی نفوسِ قدسیہ کی تبلیغ و تعلیم' تلقین و نصیحت اور تربیت و صحبت کے ذریعے ایمان کی روشنی پھیلتی رہی ہے۔ اور اگرچہ جب سے مغرب کی الحاد و مادہ پرستی کے زہر سے مسموم ہواؤں کا زور ہوا ایمان و یقین کے یہ

بازار بھی بہت حد تک سرد پڑ گئے‘ تاہم ابھی ایسی شخصیتیں بالکل ناپید نہیں ہوئیں جن کے ’’دلِ روشن‘‘ نورِ یقین اور ’’نفسِ گرم‘‘ حرارتِ ایمانی سے معمور ہیں‘ اور اب ضرورت اس کی ہے کہ ایمان و یقین کی ایک عام روا یسی چلے کہ قریہ قریہ اور بستی بستی ایسے صاحب عزیمت لوگ موجود ہوں جن کی زندگیوں کا مقصدِ وحید خدا کی رضا جوئی اور اس کی خوشنودی کا حصول ہو۔‘‘ (اسلام کی نشأۃِ ثانیہ۔ کرنے کا اصل کام‘ ص ۱۹‘ ۱۸) ☆

کارِ نبوت میں قرآن کی صراحت کے مطابق تعلیم حکمت بھی اہم عنصر ہے‘ جس سے مراد دین میں مجموعی طور پر گہری بصیرت و دانش اور فقاہت ہے۔ تعلیم حکمت کا ایک مظہر علم الکلام ہے جس کے ذریعے مجددین نے دین کو عقلی اور فلسفیانہ سطح پر دلائل و براہین کے ساتھ پیش کیا‘ نیز باطل افکار اور تصورِ حیات کا ابطال کیا۔ موجودہ دَور میں تعلیم حکمت کا سب سے زیادہ تقاضا الحاد اور مادہ پرستی کا رد اور عقائد اسلامی کا مدلّل اثبات ہے۔ تعلیمِ حکمت کے میدان میں اقدامات کے لیے ڈاکٹر صاحب نے قرآن اکیڈمی کی بنیاد ڈالی اور اس کے مقاصد (objectives) کا اظہار بھی محولہ بالا کتابچے میں ان الفاظ میں کیا: ’’خاص ذہنی استعداد رکھنے والے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت اس اکیڈمی کا اصل کام ہوگا کہ ان کو پختہ بنیادوں پر عربی کی تعلیم دی جائے۔ یہاں تک کہ ان میں زبان کا گہرا فہم اور اس کے ادب کا ستھرا ذوق پیدا ہو جائے۔ پھر انہیں پورا قرآن حکیم سبقاً سبقاً پڑھایا جائے اور ساتھ ہی حدیث نبویؐ فقہ اور اصولِ فقہ کی تعلیم دی جائے‘‘۔ بعد میں انجمن کے زیر انتظام قرآن کالج بھی انہی مقاصد کی ابتدائی تیاری کے لیے قائم کیا گیا۔ اس کی ہیئت اور سکیم آف سٹڈیز میں تبدیلی کے بیان کو کسی دوسرے وقت کے لیے مؤخر کرتے ہوئے راقم فی الحال قرآن اکیڈمی پر توجہ مرکوز کرنا چاہتا ہے‘ جس پر احیائے اسلام اور اقامتِ دین کے حوالے سے صدر مؤسس ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے مسلسل کم و بیش تیس برس خود اس کی نگرانی کی اور بڑی توقعات وابستہ کیں۔

راقم ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے بعد سے انجمن کا منتخب صدر چلا آ رہا ہے اور اس عشرہ میں قرآن اکیڈمی کے رجوع الی القرآن کورس پارٹ I اور پارٹ II کو نہ صرف قریب سے دیکھتا بلکہ اس کی جملہ انتظامی امور میں ناظمِ شعبہ تعلیم و تحقیق اسلامی عزیزم حافظ عاطف وحید کے ساتھ دلچسپی لیتا رہا ہے۔ اس دو سالہ کورس کے فضائل و برکات کے کورس کے شرکاء بالخصوص گواہ ہیں جنہوں نے تقسیم اسناد کے موقع پر قرآن و سُنّت اور فقہ کی تدریس کو نہ صرف سراہا بلکہ اپنے چند اساتذہ میں سے خاص طور پر عزیزم محمد رشید ارشد اور عزیزم مؤمن محمود کی بے حد تحسین کی‘ اور یہ عمل ایک آدھ بار نہیں بلکہ گزشتہ سولہ سترہ برس سے مسلسل ہوتا آ رہا ہے ☆☆۔ اور اسے irony of history سمجھئے یا کچھ اور‘ رجوع الی القرآن کورس کے فاضلین میں سے تو معدودے چند لیکن ان دو مدرسین نے امتیاز کے ساتھ ان اہداف کے حصول میں نمایاں خدمات سرانجام دیں جن کے حصول کے لیے قرآن اکیڈمی قائم کی گئی تھی۔ جنہوں نے

☆ اس اہم اور seminal تحریر کا انگریزی ترجمہ راقم نے لگ بھگ پینتالیس سال قبل کیا تھا۔ بعد ازاں اسی ترجمہ کو ڈاکٹر احمد افضال صاحب نے امریکہ میں بہتر انداز میں دوبارہ کیا‘ جسے وہاں کی تنظیم IONA نے شائع کیا۔

☆☆ قرآنی عربی کی تدریس میں عزیزم آصف حمید کی صلاحیتوں کا اعتراف بھی بڑے پیمانے پر کیا گیا ہے۔

تدریسی فرائض کے ساتھ گزشتہ اٹھارہ بیس سال کے دوران عربی زبان میں مہارت اور تمام علوم دینیہ میں گہری ممارست کے ساتھ دینی اور ٹھیٹھ فقہی وکلامی مسائل ومباحث میں تحقیقی نظر پیدا کی ہے۔قرآن کریم سے ذہنی وقلبی تعلق کی کیفیت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ان دونوں نے دسیوں بار رمضان المبارک میں دورۂ ترجمہ قرآن کروایا ہے جن میں شرکاء کی تعداد سینکڑوں میں رہی ہے۔

راقم یونیورسٹیوں میں طویل عرصہ فلسفہ اور سماجی علوم میں تدریسی تجربے کی روشنی میں بغیر کسی مبالغہ کے کہہ سکتا ہے کہ ماشاء اللہ استاذ رشید ارشد اور استاذ مؤمن محمود کی علمی ممارست، تبحر اور فقاہت پر 'قدرِ اوّل' کی مہر ثبت کیے بغیر چارہ نہیں۔ ان کے پائے کے اصحابِ علم وفضل شاذ کے حکم میں داخل ہیں۔ ان کے لیکچرز قرآنی معارف، گہرے دینی شعور اور لسانی معلومات کی کان ہیں اور غیر معمولی فنی اور فکری محاسن رکھتے ہیں۔ وسعتِ مطالعہ، عُمق نگاہی، دلیل وبرہان اور ذوقی ووجدانی ہر دو طریق تعلیم سے لیس ان کے لیکچرز مستقل حوالے کی چیز ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے تدریس جیسے خشک، اکثر وبیشتر بے جان اور stereotyped عمل کو تازگی اور تازہ کاری سے ہمکنار کیا ہے۔ ان کے اندازِ تکلّم کا نادر آہنگ دُور سے پہچانا جاتا ہے۔ وہ اکثر شرکاء کلاس کو مراقبہ اور سیرِ گریباں کی تلقین کرتے ہیں۔ قرآن وسُنّت پر مبنی ان کا موقف ذات کی اسارت سے رہائی ہے۔ ان کے محاضرات فکر انگیز ہونے کے ساتھ ساتھ روح پرور بھی ہوتے ہیں۔ ان کی کلاس میں چونکہ راقم بھی اکثر شریک ہوا ہے، چنانچہ بر بنائے تجربہ کہہ سکتا ہے کہ ان کی کلاس میں طلبہ کی روحانی نشاط دیدنی ہوتی ہے۔ ظرافت اور بیان میں بھی بے نظیر ہیں اور وہ طلبہ پر اکتاہٹ طاری نہیں ہونے دیتے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی کلاس درس یا محاضرہ سے زیادہ 'خاطرہ' ہوتی ہے۔ ان دونوں اساتذہ نے قرآن وحدیث کے ساتھ ساتھ کلام اور علم عقیدہ کے تمام بڑے کلاسیکی مصنفین کا گہرا اور تہہ رس مطالعہ کیا ہوا ہے۔ ان کی کتابوں کے اکثر اہم نکات اور مباحث کے مرکزی خیالات ودلائل کا عربی متن تک ان کے ذہن میں ہوتا ہے جن کے ذریعے یہ اپنی پریزنٹیشن کو مؤثر اور یقین آفرین بناتے ہیں۔

کلاسیکل فرقِ باطلہ اور جدید گمراہیوں مثلاً ہیومنزم، تشکیک اور الحاد وزندقہ پر ان کے دلائل بہت کاٹ دار اور جامع ہوتے ہیں۔ فلسفہ ڈیپارٹمنٹ اور پنجاب یونیورسٹی کے متعدد دوسرے پروفیسر حضرات سے استاذ رشید ارشد کی ان موضوعات پر گفتگو رہتی ہے۔ ان کی علمیت، وسعتِ مطالعہ اور مدلّل discourse کے حوالے سے وہ نہ صرف طالب علموں بلکہ اساتذہ میں بھی مقبول ہیں اور عزّت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ استاذ رشید ارشد اور استاذ مؤمن محمود کے مشترکات میں ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ان دونوں نے امام غزالیؒ کی کتب اور رسائل کا بہت دقتِ نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ دونوں قرآن اکیڈمی میں رجوع الی القرآن کورس کے پارٹ I اور پارٹ II میں از حد محنت اور خیال افروز انداز میں تدریس کے علاوہ ہفتہ یا اتوار کے روز اپنے گھروں پر بھی مزید مطالعے اور بحث وتمحیص کے لیے نشستوں کا اہتمام کرتے ہیں جو عموماً ڈیڑھ سے دو گھنٹے تک جاری رہتی ہیں۔ رشید ارشد نے

اپنے گھر میں ہونے والی اس نشست کو ''مصاحبت'' کا نام دیا ہے' جو خود معنی خیز ہے۔ عزیزم مؤمن محمود ترجمۃ القرآن کی ہر دو کلاسوں میں زیر درس آیاتِ قرآنیہ کی تنقیح کے لیے متقدمین کی تفاسیر کے ساتھ ساتھ بعض مشکل مقامات کی تفہیم جدید اور عصری تفاسیر سے بھی مواد دیکھ کر آتے ہیں' تاکہ قدیم اور جدید تمام مفسّرین کی آراء طلبہ کے گوش گزار کر سکیں اور ان کے ذوقِ مطالعہ اور عملِ تفکیر کو مہمیز دیں۔ گھر پر ہونے والی نشستوں میں انہوں نے کئی کتابوں کا مطالعہ کروایا جن کا آغاز دسمبر ۲۰۱۷ء سے ہوا تھا۔ اور میں خود شاہد ہوں کہ پارٹ II کے دو تین طلبہ کی عربی استعداد اتنی اچھی تھی کہ وہ کتابوں کے متن کو بآسانی پڑھ سکتے تھے۔ اشاعرہ اور ماتریدیہ کلامی اعتقادات کی تفہیم کے لیے ان کی پوری تاریخ کی وضاحت کے ضمن میں ابراہیم ابن حسن اللقانی' علامہ تفتازانی کی 'شرح المقاصد' اور امام ابراہیم بن محمد الباجوری کی 'تحفۃ المرید' کا تعارف کروایا گیا اور کچھ منتخب حصوں کا مطالعہ تشریح کے ساتھ کرایا گیا۔ مارچ تا اپریل ۲۰۲۰ء میں ہونے والی ۹ نشستوں میں امام غزالیؒ کی احیائے علوم الدین کی کتاب ''التوحید والتوکّل'' کا مطالعہ کیا گیا۔ ساتھ ہی امام ابن قیمؒ کی 'مدارج السالکین' کا بھی تعارف کروایا گیا۔ یہ کتاب اصلاً ایک صوفی بزرگ شیخ ہرویؒ کی کتاب 'منازل السائرین' کی شرح ہے۔ ۱۵ جون سے کورونا وائرس اور لاک ڈاؤن کی وجہ سے استاذ مؤمن محمود کے امام بیہقیؒ کی کتاب 'اعتقاد والھدایۃ الی سبیل الرشاد' کے ریفرنس سے عقیدۂ توحید' اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات وافعال کے ضمن میں احناف اور ماتریدی عقائد کی تشریح وتوضیح پر مبنی ہفتے میں تین دن (سوموار تا بدھ وار) ۱۱ بجے سے ۱۲:۲۰ تک آن لائن لیکچرز ہوتے ہیں' جن میں ۲۰ سے ۲۵ تک طلبہ اور جویانِ علم وحکمت شرکت کرتے ہیں۔ گھر پر ہفتہ وار نشست میں امام بیہقیؒ کی ایک دوسری تصنیف 'الاسماء والصفات' زیر مطالعہ ہے۔ امام بیہقیؒ کی متذکرہ دو کتابیں علم الکلام اور علم عقیدہ کی ان کے نزدیک گویا مستطاب کتب ہیں۔ اور شرکاء معارفِ ربّانیہ سے مستفیض ہو رہے ہیں۔

استاذ مؤمن محمود کے عربی زبان سے عشق ومناسبت کے متعدد اور شاندار مظاہر ان کے محاضرات (لیکچرز) میں بخوبی دیکھے جا سکتے ہیں۔ سالِ گزشتہ کے اواخر میں کلیۃ القرآن کی ایک محفل میں' جس میں کئی فضلاء اور پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے ایک Ph.D پروفیسر بھی موجود تھے' راقم نے اپنے صدارتی خطبہ میں ان کی فی البدیہہ پُرجوش عربی تقریر پر خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے انہیں

'Pakistani Abul Hassan Ali Nadvi in the making'

قرار دیا۔ اُمیدِ واثق کے ساتھ دعا بھی ہے کہ وہ اس ہدیۂ تبریک کے مصداق ثابت ہوں۔ مؤمن محمود کا تیقّن اور اذعان کے ساتھ وہ خیال جسے ان کے انکشافات اور اولیات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے یہ ہے کہ گزشتہ آٹھ نو عشروں سے عالمِ اسلام بالخصوص برصغیر پاک وہند کے بعض مسلمان ''محقّق'' اور خود ساختہ ''مفکّرین'' کے ہاں اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے لیے ایک نئے علم الکلام کی حدِ اعتدال سے متجاوز ناگزیریت مسلمان متقدمین کی عظیم اور شاندار علمی

تراث سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ ان میں سے اکثر علم عقیدہ کی اُمہاتِ کُتب اور مراجع ومصادر پڑھ تک نہیں سکتے‘ ان کا فہم تو دور کی بات ہے۔ چنانچہ نام نہاد دانشوروں کے اس دعویٰ کی کوئی علمی حیثیت نہیں ہے۔ ہمارے کوتاہ بین مفکّرین اور گرفتارانِ تہذیب فرنگ کی مادی تربیت‘ کج نظری اور زمہریری عقل پرستی ایک پست سطح اور ایک خاص مقام سے آگے دیکھ ہی نہیں سکتی۔ ان کا موقف‘ ان تمام دانشوروں کے علی الرغم‘ یہ ہے کہ کلامی وفکری سوالات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے زمانے ہی میں سامنے آ گئے تھے‘ مثلاً خوارج کا گروہ‘ جن کا عقیدہ یہ تھا کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ایمان سے تہی دست یعنی کافر ہو جاتا ہے۔ اور پھر اسی عقیدے کو کچھ اختلاف وترمیم کے ساتھ جہمیہ اور معتزلہ نے برقرار رکھا۔ اسی طرح قدریہ اور دوسرے فرقِ ضالہ بھی وجود میں آ گئے تھے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے قدریہ اوائل کو مجوسی قرار دیا۔ چنانچہ اسلام میں علم کلام‘ علم عقیدہ یا علم اصول الدین اور علمی نتیجہ خیزی پہلی صدی ہجری ہی میں شروع ہو گئی تھی ☆۔ عقیدۂ توحید اور مسائل ذات وصفات میں کھود کرید اور معرفت رب کے بارے میں مؤمن محمود کا یہ موقف بہت قیمتی ہے کہ ان سارے مباحث سے صرف ذہنی وعقلی سطح پر اللہ کی معرفت کا حصول ہی نہیں بلکہ اس عمل کو حق تعالیٰ سے عملی تعلق اور قلبی احوالِ حسنہ پیدا کرنے کے لیے ہونا چاہیے۔

قدیم وحادث کا تعلق‘ اللہ کی صفت قدرت اور اللہ کی صفت علم جس طرح ہمارے اشعری ماتریدی حکماء بیان کرتے ہیں اور پھر اس کی توضیح مؤمن محمود سے سننے کو ملی تو میرا احساس یہ تھا کہ ان میں ماشاء اللہ غامض کلامی مباحث کو سہل‘ بلکہ پانی کر دینے کی صلاحیت غیر معمولی ہے۔ جا بجا کثرت سے قرآنی آیات کا حوالہ اور ایقان انگیز دلائل وبیان سے ثابت کرتے ہیں کہ الٰہیات کے میدان میں مسلمان یونانیوں سے میلوں آگے تھے۔ ہمارے نامور دانشوروں کو ابوالبرکات‘ امام غزالی‘ امام رازی‘ آمدی اور امام ابن تیمیہ رحمہم اللہ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ انہوں نے قرآن کریم کی دو آیتوں:

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (سورہ محمد:۱۹) اور

فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ (الانفال:۴۰)

کے حوالے سے واضح کیا کہ ہمارا اللہ تعالیٰ کے وجود کا عقیدہ پختہ علم اور تفصیلی دلیل کی روشنی میں ہوگا تبھی اس عقیدے کے ثمرات ظاہر ہوں گے۔ اگرچہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ دلیلِ اجمالی پر کھڑا آدمی تفصیلی دلیل پر قائم آدمی سے زیادہ یقین کا حامل ہوتا ہے‘ مثلاً سادہ لوح مسلمانوں کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ توکّل وایمان میں والہانہ پن۔ دلیلِ اجمالی سے مراد وہ دلیل ہے کہ جس پر شبہ وارد ہو تو جواب ممکن نہ ہو۔ گویا عام مسلمان اجمالی دلیل پر کھڑے ہوتے ہیں‘ لیکن ظاہر ہے کہ عصر رواں کے تشکیکی اور الحادی فکر وتہذیب کا تدارک بھی درکار ہے‘ چنانچہ یہ

☆ اسی طرح دورِ حاضر کے بعض مفسّرین کا یہ خیال محل نظر ہے کہ مسلمانوں کا تعلق جب عجمی قوموں سے ہوا اور ان کے علوم اور ان کے فلسفے سے ان کو سابقہ پڑا تو دینی مسائل پر سوچنے کا وہ اندازِ فکر وجود میں آیا جس کو ہم علم کلام کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ (مبادیٔ تدبّرِ قرآن‘ صفحہ ۱۶۴)

کام علماء اور متکلّمین کرتے ہیں جنہیں دلیل تفصیلی حاصل ہوتی ہے۔ علم عقیدہ کا اثبات دو محولہ بالا آیات قرآنیہ سے ہوتا ہے جن کا آغاز 'فَاعْلَمْ' کے صیغہ امر سے ہوتا ہے۔ استاذ مؤمن محمود لبرل اور متجدد خیالات رکھنے والے حضرات پر علمی نقد کرتے ہیں کہ کس طرح وہ اللہ کی صفتِ قدرت اور صفت علم میں نقب لگاتے ہیں جس کے نتیجے میں ان میں علمی و اخلاقی بے راہ روی پیدا ہو جاتی ہے۔ دو تین معروف اور جیّد علمائے عقیدہ کے اتباع میں استاذ مؤمن محمود علم کلام اور مباحث عقیدہ میں صرف علمی و منطقی سطح پر اشتغال کو محض 'درسِ عقیدہ' سمجھتے ہیں' جبکہ وہ 'غرسِ عقیدہ' کو زیادہ اہم اور ثمر آور سمجھتے ہیں' جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی حقیقی توحید اور صفات کا کچھ پرتو اہلِ ایمان کے وجود پر اثر انداز ہو اور ان کے احوال و طبیعت میں نفوذ و انجذاب کا باعث بنے۔ یعنی قرآن ایک کلمہ گو کے وجود پر تاثیر رکھے اور اس کے پیش کردہ عقائد اس کی وجودی حالت میں متحقق ہوں۔ انہی کے آن لائن لیکچرز میں بالمشافہ سماعت کے دوران راقم کچھ ماضی قریب کے جلیل القدر اور چند نسبتاً جوان اور ہمعصر عرب فضلاء کے ناموں سے واقف ہوا' مثلاً شیخ ابوزہرہؒ' شیخ مصطفیٰ صبری آفندیؒ (سلطنت عثمانیہ کے آخری شیخ الاسلام متوفی ۱۹۵۴)' شیخ الحدیث ابواسحاق الحوینی' شیخ سعید عبداللطیف فودہ (اردنی)' الدکتور عدنان ابراہیم (فلسطینی) اور شیخ ادھم العاسی۔ مؤمن محمود فارغ لمحات اور تمام سفروں میں متحرک کتب خانہ (کتب خانہ سیّار) بشکل سمارٹ موبائل اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ دعا ہے کہ وہ لیکچرز اور محاضرات کے ساتھ ساتھ تحریر و انشاء کی طرف بھی متوجہ ہوں تاکہ ان کے خیالات تسوید و تبویب کے بعد پہلے مرحلے میں حکمت قرآن (جس کے ادارۂ تحریر میں وہ شامل ہیں) اور بعد ازاں جمع و تدوین کے بعد کتابی شکل میں شائع ہو کر علمی حلقوں میں بڑے پیمانے پر موثر ہوں اور عام مسلمانوں میں بھی تجدید ایمان و عقیدہ کا باعث بنیں۔

عزیزم محمد رشید ارشد اور عزیزم مؤمن محمود دونوں علیٰ وجہ البصیرت 'تقرب الی اللہ بالعلم والعمل' کے قائل ہیں۔ عزیزم رشید ارشد مؤمن محمود سے کم و بیش آٹھ دس برس عمر میں بڑے ہونے کے ناطے علوم القرآن' علوم الحدیث اور فقہ کی قدیم و جدید عربی امہات کتب کے ساتھ انگریزی کتب اور رسائل کا مطالعہ زیادہ رکھتے ہیں۔ چونکہ وہ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ میں لیکچرر ہیں اور پی ایچ ڈی کا مقالہ بھی کراچی یونیورسٹی میں submit کروا چکے ہیں اور ان کی پہلی ڈگری ایم بی اے کی ہے' اس لیے ان کا مطالعہ' دینی علوم (اسلامک انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد سے اصول الدین والتفسیر میں گریجویشن اور علوم الحدیث میں M.Phil ہیں) کے علاوہ فلسفہ' لٹریچر' سوشل سائنسز اور دوسرے کئی سیکولر فیلڈز میں بھی ہے۔ اس طرح واقعہ یہ ہے کہ ان کا علم موسوعی (انسائیکلو پیڈک) نوعیت کا ہے۔ کرونا لاک ڈاؤن کی وجہ سے قرآن اکیڈمی میں رجوع الی القرآن کی کلاسز شیڈول سے ڈیڑھ دو ہفتے قبل بند کرنا پڑیں۔ اس فارغ وقت کو غنیمت سمجھتے ہوئے یہ آن لائن دروس اور لیکچرز میں پہلے سے زیادہ مصروف ہو گئے۔ اگرچہ استاذ رشید ارشد جدید ٹیکنالوجی اور سوشل میڈیا وغیرہ کو تنقیدی نگاہ سے دیکھتے اور ان میڈیمز میں کچھ intrinsic مسائل پاتے ہیں' بایں ہمہ عالمی سطح پر غیر معمولی حالات کی وجہ سے ابلاغ کے لیے انہی کو

استعمال کرنا پڑا۔ان کا کہنا ہے قرنِ اوّل میں قرآن' حدیث اور فقہ کا تعلیم وتعلّم بالمشافہ (oral) ہوتا تھا' جس کی اپنی برکات تھیں۔فلسفہ وتفکیر کی دنیا میں طول طویل سفر کے باوجود وہ بحمداللہ اہل سُنّت کے روایتی اور متوارث عقائد پر پختہ یقین رکھتے ہیں اور یونیورسٹی کے اکیڈیمیا اور طلبہ اور دیگر سامعین کے سامنے دینی افکار مؤثر استدلال کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔رسوخ فی العلم' خلّاق ذہن اور ابتکار کو کام میں لاکر مضمون بندی' بیان اور بدیع کی کرشمہ کاریوں اور برجستگی کے جن عناصر سے ان کے لیکچرز اور دروس کا خمیر اٹھتا ہے اس کی مثال مَیں اپنے تجربے کی حد تک کہیں نہیں پاتا۔ایجاز اور کفایتِ لفظی کی خصوصیت بھی بدرجہ اَتم موجود ہے۔وہ رمز اور ایماء کے پردے میں گہری باتیں کہنے کا ہنر جانتے ہیں۔میرا احساس ہے کہ دینی حقائق ان کے لیے 'شنیدہ' نہیں 'دیدہ' کا حکم رکھتے ہیں' اور اپنا یہی ایقان سامعین اور طلبہ میں منتقل کرتے ہیں۔لبرل اور الٹرا جدیدیت پر ان کی مدلّل تنقید دین و شریعت کی ماثور ومتواتر روایت کے احیاء میں ازحد ممد ثابت ہوتی ہے۔اور یہ تبدیلی ان کے سینکڑوں طلبہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

رشید ارشد صاحب کے اوائل مارچ سے چند اہم آن لائن شروع ہونے والے پروگرام ہر اعتبار سے اہم' ایمان افروز اور تحقیق وجستجو کو مہمیز دینے والے ہیں۔ان میں سرفہرست ابوالفضل قاضی عیاضؒ مالکی اندلسی (۴۷۶۔۵۴۴ھ) کی کتاب الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ ﷺ ہے' جس کے گھنٹے گھنٹے بھر کے ۱۹ دروس ریکارڈ کیے گئے' جنہیں فقہ اکیڈمی کراچی کے جناب مفتی اویس پاشا نے بڑے اہتمام سے اپنے نیٹ ورک سے براڈ کاسٹ کیا۔اس کی صرف پہلی دو تین ویڈیو ریکارڈنگ تھیں' باقی آڈیو ہیں۔اہل علم قاضی عیاضؒ کی سیرت وشمائلِ نبویؐ اور آپ ﷺ کی شان وعظمت کے بیان میں اس کتاب کی قدر و قیمت سے واقف ہیں۔ استاذ رشید ارشد نے رسول اللہ ﷺ کے مرتبہ ومقام پر انتہائی دلبستگی کے ساتھ علمی انداز میں گفتگو کی ہے۔انہیں سن کر سامعین کے قلوب ضرور محبّتِ رسول ﷺ کی حلاوت سے شاداں ہوکر اتباعِ رسولؐ پر مائل ہوں گے۔اس کے فوراً بعد ہی احادیث فتن' اشراط الساعۃ اور ظہورِ دجال کے موضوع پر آنجناب کے گھنٹے گھنٹے کے ۱۴ محاضرات ریکارڈ ہوئے۔ان کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ چونکہ ہم دورِ فتن میں جی رہے ہیں اس لیے اس میں علم صحیح اور دینی فقاہت کی ضرورت دوچند ہوجاتی ہے۔لیکن ساتھ ہی ہمیں اس روایت کی طرف بھی توجّہ دینی ہے جس کے مطابق آخر زمان میں فقہاء قلیل اور خطباء کثیر ہوں گے اور سفیہہ اور سطحی علم کے لوگ بڑے بڑے معاملات میں کلام کریں گے۔اس صورت حال میں سُنّت سے تمسک ہی ہمارے لیے سفینۃ النّوح کا کردار ادا کرسکتا ہے۔ ان کے خیال میں اشراط الساعۃ کی احادیث کی واقعات پر تطبیق بہت اہم اور حساس ایشو ہے۔ہمیں متعین ٹائم فریم کے ساتھ واقعات کی پیشین گوئیوں کے معاملے میں احتیاط کرنی چاہیے۔اس ضمن میں انہوں نے بلادِ عرب کے کئی فضلاء کا تنقیدی جائزہ پیش کیا۔دجال کے حوالے سے گفتگو میں انہوں نے شخص دجال کے ساتھ عصرِ رواں کی پوری دجالی تہذیب پر بھی روشنی ڈالی۔توقع ہے کہ ان مضامین کو transcribe کرکے موضوعاتی

ترتیب‘ احادیث کی تخریج اور مناسب حک واضافے کے بعد قابل اشاعت بنایا جاسکے گا۔ راقم کو بتایا گیا ہے کہ یہ کام فقہ اکیڈمی کراچی شروع کر چکی ہے‘ جو باعث اطمینان ہے۔

رمضان المبارک میں لاک ڈاؤن کے باعث کہیں بھی مساجد میں اس بار دورۂ ترجمہ قرآن نہ ہوسکا۔ اس کی تلافی عزیزم رشید ارشد نے اس طرح کی کہ انہوں نے اپنے ذوق کے مطابق قرآن کریم کے اوّلین اردو تراجم میں سے انتخاب کیا‘ جسے سب سے زیادہ پذیرائی ملی‘ یعنی حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ کا ترجمہ وفوائد بعنوان ’’موضحِ قرآن‘‘ کو۔ یہ اگرچہ آج سے کم وبیش اڑھائی سو سال پرانی اردو میں ہے لیکن اس میں خاندان ولی اللّٰہی کے فکر کی جھلکیاں صاف طور پر نمایاں ہیں۔ بامحاورہ ترجمہ ہونے کے باوصف معنی خیز اور سلف صالحین کے فہم کی پوری پوری ترجمانی پر مشتمل ہے۔ اس ضمن میں حضرت اقدس مولانا قاسم نانوتویؒ کا یہ مقولہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ’’اگر (بالفرض) اردو میں قرآن نازل ہوتا تو شاید اس کی تعبیرات وہی یا اس کے قریب قریب ہوتیں جو اس ترجمہ کی ہیں‘‘۔ دارالعلوم دیوبند کے گرامی قدر فضلاء میں سے مولانا اخلاق حسین قاسمیؒ (متوفی ۲۰۰۹ء) نے کئی سالوں کی محنتِ شاقہ کے بعد مستند موضح قرآن کی اشاعت ممکن بنائی جو قبل ازیں چھپنے والے موضح قرآن کی کمپوزنگ میں در آنے والی اغلاط سے پاک ہے۔ مولانا قاسمیؒ دوبار لاہور تشریف لائے تو برادرِ محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ کو شرفِ میزبانی کے ساتھ طویل علمی گفتگوؤں کا موقع بھی ملا۔ پاکستان میں ’’مستند موضح قرآن‘‘ اور مولانا قاسمیؒ کی ۸۵۰ صفحات پر مشتمل کتاب ’’محاسنِ موضحِ قرآن‘‘ کی طباعت میں ممد ومعاون مولانا سعید الرحمن علویؒ بھی ان نشستوں میں شامل ہوتے تھے۔ راقم کے ذہن میں ان ایام کی یادیں تازہ ہیں۔ بحمد اللہ عزیزم رشید ارشد پر قرآن کریم سے شغف اور ذہنی مناسبت کے سبب شاہ عبدالقادرؒ کے رموز ونکات اور غموض کا خصوصی انکشاف ہوا ہے۔ انہوں نے حضرت شاہ صاحبؒ کے نادر وبے مثل ترجمہ اور تفسیری فوائد کے علمی وادبی محاسن پر بڑی فاضلانہ بحث کی ہے اور راقم کی نظر میں خاندانِ ولی اللّٰہی کے علوم کا یہ بیش بہا خزانہ پہلی مرتبہ اس وضاحت کے ساتھ اہل علم اور عام اُمّت کے سامنے آرہا ہے۔ یکم رمضان المبارک سے شروع کیا ہوا یہ دورہ ترجمہ قرآن اختتامِ رمضان پر صرف غالباً چودہ پاروں تک ہوا تھا۔ بعد ازاں اس کو ہفتے میں سوا گھنٹے کی تین ویڈیوز کے ذریعے جاری رکھا گیا اور اب سورۃ الزمر زیر درس ہے۔ دورۂ ترجمہ قرآن کی یہ ویڈیوز جناب نعمان واجد عزیز (یکے از فضلاء قرآن اکیڈمی‘ رجوع الی القرآن کورس) کے زیر انتظام بصیرہ انسٹی ٹیوٹ YouTube پر اَپ لوڈ کر رہا ہے۔ قارئین ان سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ یہ دورۂ ترجمہ قرآن‘ ان شاء اللہ‘ اواخر ستمبر تک مکمل ہو جائے گا۔

راقم کے اصرار پر عزیزم رشید ارشد نے اپنے مطالعات‘ لیکچرز اور دروس کے موضوعات اور وہ کتب جو انہوں نے طلبہ کو سبقاً سبقاً پڑھائیں‘ کی مختصر لسٹ دی ہے جو درج ذیل ہے:

موضوعات تعلیم وتدریس

علوم الحدیث

تیسیر مصطلح الحدیث، اصول الحدیث، اصول التخریج، قواعد الجرح والتعدیل، الوضع فی الحدیث

حدیث کے بنیادی مباحث

حجیت حدیث، حدیث کی ضرورت واہمیت، انکارِ حدیث کے اسباب، فتنہ انکارِ حدیث کے نتائج

الحدیث النبوی

- التجرید الصریح لاحادیث الجامع الصحیح (علامہ زبیدی)
- مختصر بخاری
- مختصر صحیح مسلم (علامہ منذری)
- سنن الترمذی (مکمل)
- ریاض الصالحین (امام یحییٰ بن شرف النووی)
- الادب المفرد (محمد بن اسماعیل بخاریؒ) ۔ نبویؐ اخلاق وآدابِ زندگی
- المنار المنیف فی الصحیح والضعیف (حافظ ابن قیم الجوزیہ)
- الاربعین النوویہ • الشمائل المحمدیہ (امام ترمذی)

العقیدۃ

- العقیدۃ الطحاویۃ (امام ابی جعفر احمد بن محمد الطحاوی)
- العقیدۃ الواسطیۃ

التزکیۃ والاحسان

- منتخب احیاء علوم الدین (محمد بن محمد ابوحامد الغزالی)
- منتخب تلبیس ابلیس (علامہ ابن جوزی)
- منتخب کتاب الفوائد (حافظ ابن القیم الجوزیہ)
- منتخب فتاوی ابن تیمیہ
- رسالۃ المسترشدین (الحارث بن اسد المحاسبی ت: ۲۴۳ھ)
- اقوال الحسن البصری
- المرشد المعین علی الضروری من علوم الدین (امام عبدالواحد بن عاشر المالکی الاشعری ت: ۱۰۴۰ھ) یہ منظوم ہے۔ اس میں ۱۳۱۷ ابیات ہیں، اس کے مولف فقہ مالکی سے تعلق رکھتے ہیں۔
- نظم، محارم اللسان (محمد مولود بن احمد فال الموسوی الیعقوبی الموریتانی ت: ۱۳۲۳ھ)
- رسالہ اصول الطریق (زروق، احمد بن احمد ۸۴۶۔۸۹۹ھ) یہ احسانِ اسلام سے متعلق رسالہ ہے۔

دل کی دنیا (مفتی محمد شفیعؒ)

شعروسخن

- انتخاب کلام اکبرالہ آبادی

اقبالیات

- اقبال اور قرآن
- اقبال اور مغربی تہذیب
- کلامِ اقبال (مسجد قرطبہ' ساقی نامہ' ذوق وشوق' ابلیس کی مجلس شوریٰ' لینن خدا کے حضور میں)

فکر وفلسفہ

- سیکولرازم کیا ہے' سیکولرزم کے مسلم معاشروں پر اثرات' اسلام اور سیکولرزم' جدیدیت کیا ہے
- اسلام اور جدیدیت (حسن عسکری کی کتاب جدیدیت کا سلسلہ وار مطالعہ)
- تعارف خطبات اقبال' فلسفہ کے بنیادی مسائل' تہذیب جدید کے بنیادی اصول
- بے خدا تہذیب: اسباب واثرات' دینی بیانیہ اور تفہیم مغرب' عالمِ مغرب میں اسلام کے رجحانات' جدید برائیوں سے کیسے بچا جائے' میڈیا اور اس کے اثرات' اسلام اور سائنس

متفرق موضوعات

- کتاب الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ ﷺ (ابوالفضل قاضی عیاض مالکی اندلسی ۴۷۶۔۵۴۴ھ) یہ سیرت و شمائل کی کتاب ہے۔ اس پر سترہ اٹھارہ گھنٹے بھر کی ویڈیوز ریکارڈ کی گئیں۔
- کتاب الفتن والبلایا والمحن والرزایا (العزعبدالعزیز بن عبدالسلام) اس میں انہوں نے مصائب کے ۱۷ فوائد ذکر کیے ہیں۔
- بدایۃ السول فی تفضیل الرسول ﷺ (العزعبدالعزیز بن عبدالسلام السلمی ت: ۵۷۷ھ)

- **Contemporary Debates in Hdith Studies**
- **Hadith Sciences**
- **Selected Contentions (Abdul Hakeem Murad)**
- **An Introduction to Nietzsche**
- **Islam and Science (Courses taught to M.Phil classes at University of Management and Technology, Lahore)**

ایمانی حقائق کے معاشرے میں سرایت ونفوذ (osmosis) اور رفتہ رفتہ ایک خدا شناس تہذیب کی بازیافت مؤسس انجمن خدام القرآن ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے کتابچے ''اسلام کی نشاۃِ ثانیہ: کرنے کا اصل کام'' میں واضح کیے گئے پروگرام کے تحت اسی وقت ممکن ہے کہ جب ہم بڑے پیمانے پر تشکیک و الحاد کو علمی طور پر counter کر کے حقائق ومعارفِ دین سماج کے ذہین افراد تک مؤثر انداز میں منتقل کریں۔ اور اس کام کی انجام دہی کسی بڑی جماعت یا ہیئتِ اجتماعی کی بجائے حلقات' سلسلہ درس و تدریس یا اکیڈمی اور چھوٹے چھوٹے collectives کی شکل میں ممکن ہے' جن میں لمبا چوڑا اداراتی نظم اور دفتری پن نہ ہو' بلکہ ایسا سیٹ اپ ہو جس

میں طلبہ‘ جویانِ حق اور تشنگانِ علوم اسلامیہ مستفیض و مستفید ہوں اور اپنے قلوب و اذہان کو ایمان و یقین کے نور سے منور کر رہے ہوں۔ ساتھ ہی یہ ایمان و عقیدہ ان کے وجودی احوال میں متحقق ہو کر ان کے اخلاق و اعمال کو نہ صرف قرآن و سُنّت کے قالب میں ڈھال دیں بلکہ وہ دینی تعلیمات و اقدار کے داعی بھی بن جائیں۔ اور اس طرح تہذیب اور معاشرے کی سطح پر حقیقی اور دیرپا اسلامی تبدیلی کا باعث بنیں۔

اللّٰھم ارنا الحق حقًّا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ

سانحۂ ارتحال

پچھلے دنوں سابق امیر جماعت اسلامی جناب سید منور حسن اڑھائی تین ہفتے ہسپتال میں زیر علاج رہنے کے بعد اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ ان کی نوجوانی کی شخصیت کے گہرے نقوش آج بھی ذہن پر ثبت ہیں۔ راقم نے جب ستمبر ۱۹۶۳ء میں کراچی یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ میں بی اے آنرز کے لیے داخلہ لیا تو منور حسن صاحب نے اسی سال سوشیالوجی میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔ وہ ان دنوں اسلامی جمعیت طلبہ کے ناظم اعلیٰ تھے۔ میں اپنے عم زاد بھائی مظفر احمد مرحوم کے ساتھ ہر ہفتے بروز اتوار ایس ایم کالج اور برنس روڈ کے درمیان واقع اسٹریچن روڈ پر جمعیت کے مرکزی دفتر پہنچ کر ڈیڑھ دو گھنٹے کے پروگرام میں شریک ہوا کرتا تھا۔ قرآن و حدیث اور دینی تعلیمات سے ابتدائی شناسائی قبل ازیں منٹگمری (حال ساہیوال) میں ’دارالمقامہ‘ میں قیام کے دوران برادر محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے دروس قرآن اور مولانا عبدالغفار حسنؒ کی تربیت و شفقت سے شروع ہو گئی تھی۔ کراچی میں ڈیڑھ دو سال بیسیوں بار جمعیت کے مرکزی دفتر میں منور حسن صاحب کا درس قرآن باقاعدگی سے سنا جس سے ذہن و قلب طراوت پاتے تھے۔ قرآن کریم کی مختلف سورتوں میں سے خاص طور پر سورۃ القیامہ کے دروس مجھے آج بھی یاد ہیں‘ جو بہت متاثر کن تھے اور ان کی تاکید پر وہ سورۃ بھی اسی وقت میں نے حفظ کر لی تھی۔ وہ بہت ہی نفیس‘ ایمانی جذبات سے لبریز اور اخلاص کیش انسان تھے۔ طویل عرصے جماعت اسلامی کے سیکرٹری جنرل اور بعد ازاں امیر جماعت کی حیثیت میں منصورہ لاہور میں مقیم رہے۔ اس دوران ان کا متعدد بار قرآن اکیڈمی آنا ہوا اور اس طرح تجدید ملاقات اور پرانے واقعات کو یاد کر کے محظوظ ہوتے۔ برادر محترم اسرار صاحبؒ کی قاضی حسین احمدؒ اور منور حسن صاحبؒ سے کئی بار ملاقاتیں اور تبادلہ خیال ہوا‘ لیکن یہ دونوں جماعت کی الیکشن کی پالیسی ہی پر جازم تھے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ امیر جماعت کی حیثیت میں منور حسن صاحب نے بعض قومی سیاسی و دفاعی ایشوز پر جو اصولی موقف اختیار کیا اس میں کبھی کبھی ڈاکٹر اسرار صاحب کے بعض مواقف اور آراء سے مشابہت نظر آتی تھی۔ بہرحال جناب منور حسن صاحب نے اسلام کی سربلندی کے لیے خلوص کے ساتھ اپنی پوری توانائیاں اور اوقات کھپا دیے اور دین کے لیے محنت کرنے والوں کے لیے ایک روشن مثال قائم کر دی۔

تغمدہ اللّٰہ تعالیٰ بواسع رحمتہ وغفرانہ وتقبل حسناتہ وتجاوز عن زلاتہ۔ آمین یارب العالمین!!

مِلاکُ التأوِیل (۲۲)

تالیف: ابوجعفر احمد بن ابراہیم بن الزبیر الغرناطی
تلخیص وترجمانی: ڈاکٹر صہیب بن عبدالغفار حسن

سُورۃُ الاعراف

(۱۳۲) آیت ۶۲:

﴿اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۲﴾﴾

''مَیں تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچا رہا ہوں اور میں تمہیں نصیحت کرتا رہوں گا اور میں اللہ کی جانب سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔''

اور پھر اسی سورت میں حضرت ہود علیہ السلام کے قصہ کے ضمن میں ارشاد فرمایا:

﴿اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِیْنٌ ﴿۶۸﴾﴾

''اور مَیں تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں اور تمہارے لیے نصیحت کرنے والا اور امین ہوں۔''

یہاں دو سوال ذہن میں اُبھرتے ہیں۔ پہلی آیت میں صیغہ فعل کے ساتھ کہا: ''اَنْصَحُ لَكُمْ'' اور دوسری آیت میں صیغہ اسم فاعل کے ساتھ کہا: ''وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِیْنٌ''۔ اور دوسرا سوال یہ ہے کہ دونوں انبیاء (نوح اور ہود علیہما السلام) اللہ کی جانب سے وہ کچھ جانتے ہیں جو کہ لوگ نہیں جانتے' تو پھر صرف نوح علیہ السلام کی زبان سے تو یہ بات کہلوائی گئی: ﴿وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۲﴾﴾ لیکن ہود علیہ السلام سے یہ بات نہیں کہلوائی گئی۔

جواباً عرض ہے کہ نوح علیہ السلام کی قوم نے اُنہیں کھلی کھلی گمراہی میں ہونے کا طعنہ دیا تھا: ﴿اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۶۰﴾﴾ یعنی تم گم کردہ راہ ہو' تمہیں نہیں معلوم کہ ہدایت کا راستہ کیا ہے؟ جس کے جواب میں نوح علیہ السلام نے کہا: ﴿لَیْسَ بِیْ ضَلٰلَةٌ﴾ ''میرے ساتھ گمراہی نہیں ہے''۔ اور پھر یہ واضح کیا کہ وہ تو اللہ کی طرف سے بھیجے گئے ہیں تو گم کردہ راہ کیسے ہو سکتے ہیں! ﴿وَلٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۶۱﴾﴾ یعنی اللہ تعالیٰ جو کہ تمام عالَم کا خالق ہے' وہ لوگوں کی ہدایت کے لیے ایسے شخص ہی کو بھیج سکتا ہے جو ہدایت کے اعلیٰ درجے پر فائز ہو۔ پھر انہیں یقین دلایا کہ وہ تو انہیں اللہ کے پیغامات پہنچاتے رہیں گے اور انہیں نصیحت کرتے رہیں گے:

﴿اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ﴾۔ پھر اس کے بعد یہ کہنا مناسب تھا کہ ایسا نہیں ہے جیسے تم سمجھتے ہو‘ بلکہ میں تو وہ کچھ جانتا ہوں جو کہ تم نہیں جانتے‘ اس لیے کہ مجھے بتانے والی تو خود اللہ کی ذات ہے: ﴿وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۶۲﴾ اور دونوں باتوں کے لیے صیغہ فعل استعمال کیا: ’’اَنْصَحُ‘‘ اور ’’اَعْلَمُ‘‘۔ جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تم چاہے کتنا ہی جھٹلاؤ‘ مَیں تمہیں نصیحت کرتا رہوں گا اور یہ کہ میرے پاس وحی آتی رہے گی اور میرا علم بڑھتا رہے گا۔ اور یوں ان دو کلمات سے ان کے غلاظت سے بھرے قول اور جہالت سے بھری متکبرانہ ذہنیت کا توڑ ہوتا گیا۔

اور جہاں تک حضرت ہود علیہ السلام سے سوال و جواب کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں عرض ہے کہ قومِ ہود نے حضرت ہود علیہ السلام کو مخاطب کرتے ہوئے یہ کہا تھا: ﴿اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ سَفَاهَةٍ﴾ (آیت ۶۶) ’’بے شک ہم تمہیں کم عقلی میں دیکھتے ہیں‘‘۔ گویا انہیں اس بات کا طعنہ دیا جا رہا ہے کہ وہ جلد باز ہیں‘ بات کی تحقیق نہیں کرتے اور ان میں بردباری کا فقدان ہے۔ جواباً ہود علیہ السلام کہتے ہیں: ﴿لَیْسَ بِیْ سَفَاهَةٌ﴾ (آیت ۶۷) ’’مجھ میں ذرا بھی کم عقلی نہیں ہے‘‘۔ اور اس کے بعد وہ اپنے رسول ہونے اور رسالت کی ذمہ داریوں کو نبھانے کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ﴿اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ﴾ ’’اور مَیں تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا رہتا ہوں‘‘۔ یہاں فعل کا صیغہ ہے کہ جس سے ایک کام کے بار بار ہونے اور مستقل ہوتے رہنے کی طرف اشارہ ہے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا: ﴿وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِیْنٌ ۝﴾ ’’اور میں تمہارے لیے ایک خیر خواہ ہوں اور دیانت دار ہوں۔‘‘

یہاں ان دو صفات کو لا کر اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ وہ ناصح ہیں‘ امانت دار ہیں‘ یعنی جلد باز یا بردباری سے عاری شخص نہیں ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے سورۃ البقرۃ میں منافقین کے قول کے جواب میں کہا گیا تھا: ﴿اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا یَعْلَمُوْنَ ۝۱۳﴾ ’’خبردار ہو جاؤ! بے شک وہی لوگ بیوقوف ہیں لیکن اس بات کو جانتے نہیں ہیں‘‘۔ یہاں بجائے فعل (اَنْصَحُ) کے انہوں نے دو اسماء (یعنی نَاصِحٌ اَمِیْنٌ) لا کر اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہ دونوں وصف ان کی زندگی کے ساتھ پیوستہ ہیں‘ کبھی ان سے جدا نہیں ہوتے۔ اگر ’’فِعل‘‘ لاتے تو یہ مقصود حاصل نہ ہوتا۔

یہاں پھر سورۃ البقرۃ کا مضمون ملاحظہ ہو‘ جہاں منافقین کے دو قول نقل ہوئے ہیں: ﴿وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ﴾ ’’جب وہ ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے‘‘۔ ’’اٰمَنَّا‘‘ فعل ماضی ہے کہ جس سے دوام ثابت نہیں ہوتا‘ یعنی ہم اپنے ایمان پر ہمیشہ قائم نہیں رہتے ہیں۔ ’’فعل‘‘ اگر ایک دفعہ بھی کیا جائے تب بھی اس ’’فعل‘‘ کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے‘ لیکن جب انہوں نے اپنے ہم پیالہ و ہم نوالہ ساتھیوں کا ذکر کیا تو یہ الفاظ کہے گئے: ﴿وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَیٰطِیْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ۝۱۴﴾ ’’اور جب وہ اپنے شیطانوں کے ساتھ تنہا ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں‘ ہم تو صرف مذاق کر رہے تھے‘‘۔ ’’مُسْتَهْزِءُوْنَ‘‘ اسم ہے اور اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ وصف ان کے ساتھ

قائم و دائم رہتا ہے‘ کوئی ایک دو دفعہ والی بات نہیں ہے۔ بالکل یہی بات ہود علیہ السلام کے قول ﴿وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ ۝﴾ سے ثابت ہوتی ہے۔ مخالفین کی بات کا رد بھی ہو گیا اور اپنے دفاع کا حق بھی ادا کر دیا اور اس طرح جملہ اسمیہ لا کر وہ کچھ کہہ دیا جو جملہ فعلیہ سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اور ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ نوح علیہ السلام کا جملہ فعلیہ سے جواب دینا کیوں ضروری تھا‘ اور ان کا یہ کہنا: ﴿وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۶۲﴾ ’’اور میں من جانب اللہ وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے‘‘ مخالفین کے تمام الزامات کی نفی کے لیے تھا۔ گویا دونوں قصوں میں جو بھی الفاظ آئے ہیں وہ اپنی جگہ پوری پوری مناسبت رکھتے ہیں۔ واللہ اعلم!

یہاں ایک اور سوال بھی وارد ہوتا ہے کہ چاہے نوح علیہ السلام ہوں یا ہود علیہ السلام‘ انہوں نے کافر اقوام کو ایمان لانے کی دعوت دی تھی‘ لیکن جب نوح علیہ السلام کی قوم کا تذکرہ آیا تو کہا: ﴿قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖ﴾ (آیت ۶۰) ’’ان کی قوم کے سرداروں نے کہا‘‘۔ اور ہود علیہ السلام کی قوم کے بارے میں فرمایا: ﴿قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ﴾ (آیت ۶۶) ’’ان کی قوم کے ان سرداروں نے جنہوں نے کفر کیا تھا کہا‘‘۔ تو اس اختلاف کا سبب کیا ہے؟ یعنی دونوں ہی کُفّار تھے‘ لیکن ایک کے ساتھ وصف کفر لایا گیا اور دوسرے کے ساتھ نہیں؟ ہمارے نزدیک (واللہ اعلم) اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ نوح علیہ السلام کا یہ کہنا: ﴿اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝۵۹﴾ ’’میں تم پر ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں‘‘ ان کے کفر کی بنا پر تھا‘ اس لیے صراحت کے ساتھ ان کے کافر ہونے کا تذکرہ کرنا ضروری نہ تھا۔ برخلاف ہود علیہ السلام کے جہاں انہوں نے ایسے کسی خدشہ کا ذکر نہیں کیا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا تھا: ﴿اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝۶۵﴾ ’’تو پھر تم لوگ ڈرتے کیوں نہیں ہو؟‘‘ اس لفظ میں ڈرانے کا وہ سخت انداز نہیں ہے جو ﴿اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝﴾ میں نظر آتا ہے۔ کیونکہ جہاں تک تقویٰ اختیار کرنے کا تعلق ہے تو وہ تو ایک مؤمن سے بھی مطلوب ہے‘ یا اگر کوئی صغیرہ گناہ کا ارتکاب کر رہا ہو تو اس سے بھی کہا جا سکتا ہے: اَلَا تَتَّقِی اللّٰہَ؟ (کیا تم اللہ سے ڈرتے نہیں ہو؟)

خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ نوح علیہ السلام کے متذکرہ قول کہ جس میں ان (کی قوم) کے کفر کی طرف اشارہ ہے‘ کافی تھا۔ اس لیے ان کے سرداروں کے کافر ہونے کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔ بالکل ایسا ہی اسلوب صالح علیہ السلام اور شعیب علیہ السلام کے قصوں میں بھی ہے‘ وہاں بھی ان دونوں کی قوموں کے بارے میں کہا گیا:

﴿قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ﴾ (آیت ۷۵ اور ۸۸)

’’اور کہا ان سرداروں نے جنہوں نے ان کی قوم میں سے تکبّر کیا تھا‘‘

تکبّر یا استکبار ان کے کفر کی بنا پر ہی تھا‘ یعنی ان کے جرم کو صراحت سے بیان کر دیا گیا‘ کیونکہ نوح علیہ السلام کی مانند انہوں نے اپنی قوم کے بارے میں کوئی سخت الفاظ نہیں کہے تھے‘ بلکہ ہود علیہ السلام کی مانند صرف انہیں ایمان لانے کی دعوت دی تھی‘ اس لیے جس طرح وہاں ان کے سرداروں کے کفر کا صریحاً تذکرہ ہے‘ ان دونوں انبیاء کے سرداروں کا ویسے ہی تذکرہ ہے کہ وہ لوگ تکبّر کیا کرتے تھے جو کہ کفر ہی کی علامت ہے۔ واللہ اعلم!

(۱۳۳) **آیت ۶۴:**

﴿فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ ۝۶۴﴾

''تو انہوں نے اُسے جھٹلایا' تو ہم نے اُسے اور جو لوگ کشتی میں اس کے ساتھ تھے نجات دی اور ان لوگوں کو غرق کر دیا جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا۔ بے شک وہ لوگ اندھے ہو چکے تھے۔''

اور سورۂ یونس میں ارشاد فرمایا:

﴿فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰۗىِٕفَ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ۝۷۳﴾

''تو انہوں نے اسے جھٹلایا تو ہم نے اسے اور جو اس کے ساتھ کشتی میں تھے نجات دی اور ہم نے انہیں (ایک دوسرے کا) جانشین بنایا اور ہم نے ان لوگوں کو غرق کر دیا جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا۔ تو پھر دیکھو! کہ جن لوگوں کو ڈرایا گیا تھا ان کا انجام کیا ہوا؟''

یہاں چار سوالات ابھرتے ہیں' پہلے دو سوال نحو و صرف سے متعلق ہیں:

(۱) پہلی آیت میں ''اَنْجَيْنَا'' (باب افعال) لایا گیا اور دوسری آیت میں نَجَّيْنَا (باب تفعیل) لایا گیا؟

(۲) پہلی آیت میں اسم موصول ''الَّذِيْ'' لایا گیا اور دوسری آیت میں ''مَنْ'' تو اس کا کیا سبب ہے؟

(ان دونوں سوالات کے جوابات پہلے اختصار کے ساتھ دیے جاتے ہیں' جس میں نحوی بحث کو حذف کر دیا گیا ہے: مترجم)

ہم پہلے بھی واضح کر چکے ہیں کہ کلمات کی ترتیب اور قرآن کی سورتوں کی ترتیب میں اس اصول کو ملحوظِ خاطر رکھا گیا ہے کہ پہلے آنے والی سورتوں میں فعل اپنی اصلی یا اساسی حالت میں آتا ہے اور بعد کی سورتوں میں اسی فعل کے دوسرے اشتقاقات کو حسب موقع لایا جاتا ہے اور یہی قاعدہ اسماء موصولہ میں بھی روا رکھا گیا ہے۔

ایک فعل ثلاثی کو متعدی بنانے کے لیے پہلا باب ''افعال'' ہے جس میں ''أ'' (ہمزہ) کا اس غرض کے لیے اضافہ کیا جاتا ہے۔ اس لیے پہلی آیت میں ''اَنْجَيْنَا'' (باب افعال) لایا گیا اور ترتیب کے لحاظ سے بعد والی سورت میں نَجَّيْنَا (باب تفعیل) لایا گیا۔ اسی طرح اسماء موصولہ میں ''الَّذِيْ'' اور اس کے مشتقات اصل ہیں' اس لیے وہ پہلی سورت میں لائے گئے' جبکہ ''مَنْ'' وہ اسم موصول ہے جو استفہام' شرط اور دوسرے معانی کے لیے بھی لایا جاتا ہے' اس لیے اسے بعد والی سورت میں لایا گیا۔

ایک دوسری مناسبت یہ بھی ہے کہ ''اَنْجَيْنَا'' میں خط کے اعتبار سے الف لکھا جاتا ہے اور نطق کے اعتبار سے ہمزہ پڑھا جاتا ہے' یعنی یہ حرف ساکن نہیں بلکہ متحرک ہو جاتا ہے' اور اس کے مقابلے میں ''نَجَّيْنَا'' کے حروف کم شمار ہوں گے' اس لیے مناسب تھا کہ ''اَنْجَيْنَا'' کے ساتھ زیادہ حروف والا اسم موصول (اَلَّذِيْ) لایا

جائے اور کم حروف والے فعل (نَجَّیْنَا) کے ساتھ کم حروف والا اسم موصول یعنی ''مَنْ'' لایا جائے۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ سورۃ یونس میں ''وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ'' کا اضافہ ہے جو کہ سورۃ الاعراف میں مذکور نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سورۂ یونس کے آغاز میں قوموں کی ہلاکت کا اور ان کے بعد ان کے جانشینوں کے آجانے کا تذکرہ تھا' فرمایا:

﴿وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا ۙ وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ﴾ (آیت ۱۳)

''اور ہم نے تمہارے سے پہلے کئی گروہوں کو ہلاک کیا جب انہوں نے ظلم کیا' اور ان کے رسول کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے تھے۔''

اور پھر اگلی آیت میں کہا:

﴿ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۱۴﴾

''اور پھر ہم نے تمہیں زمین میں جانشین بنایا ان کے بعد تاکہ ہم یہ دیکھ سکیں کہ تم کیسے کام کرتے ہو۔''

یہاں ایک عمومی قاعدہ بتایا گیا تھا' اور پھر قصہ نوح علیہ السلام کے ضمن میں اسی بات کو خاص طور پر بتا دیا گیا کہ قومِ نوحؑ تو تباہ کر دی گئی' لیکن جو لوگ بچ گئے وہ ان کے جانشین بنا دیے گئے۔

چوتھا سوال یہ ہے کہ سورۃ الاعراف کے آخر میں قومِ نوحؑ کے بارے میں کہا گیا: ﴿اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ ۶۴﴾ ''بے شک وہ لوگ اندھے ہو چکے تھے''۔ اور سورۂ یونس کے آخر میں انہی کے بارے میں کہا گیا: ﴿فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ۷۳﴾ ''پھر دیکھو کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جنہیں ڈرایا گیا تھا۔''

اس کا جواب یہ ہے کہ جب لوگوں نے نوح علیہ السلام کو کھلی کھلی گمراہی کا شکار ہونے کا طعنہ دیا: ﴿اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۶۰﴾ تو اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ نہیں' وہ گمراہ نہیں ہیں بلکہ تم لوگ ہدایت پانے سے اندھے ہو چکے ہو: ﴿اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ ۶۴﴾۔ اور چونکہ سورۃ الاعراف میں ڈرائے جانے کا ذکر آ چکا تھا' ان الفاظ کے ساتھ: ﴿اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ﴾ (آیت ۶۳) ''کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہے کہ تمہیں تمہارے رب کی طرف سے ایک آدمی (کے توسط سے) یاددہانی کرائی گئی ہے تاکہ وہ تمہیں ڈرا سکے''۔ تو مناسب ہوا کہ سورۂ یونس میں انہی ڈرائے جانے والے لوگوں کے انجام کا تذکرہ کر دیا جائے: ﴿فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ۷۳﴾۔ چنانچہ ایک سورت میں ''اِنذار'' کا تذکرہ ہو گیا اور دوسری سورت میں ''مُنذِرین'' کے انجام کا تذکرہ ہو گیا۔ واللہ اعلم!

(۱۳۴) آیت ۷۳:

﴿قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْۗءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۷۳﴾

''تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے کھلی کھلی نشانی آ چکی ہے (اور وہ ہے) اللہ کی یہ اونٹنی جو تمہارے لیے ایک نشانی ہے تو اسے اللہ کی زمین میں کھاتا چھوڑ دو اسے برائی کے ساتھ ہاتھ بھی نہ لگانا کہ کہیں تمہیں ایک دردناک عذاب آ لے۔''

اور سورۂ ہود میں ارشاد فرمایا:

﴿وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ۝۶۴﴾

''اور اے قوم! یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لیے ایک نشانی ہے اسے اللہ کی زمین میں کھاتا چھوڑ دو اور اسے بُرائی سے مت چھونا کہ کہیں تمہیں ایک قریبی عذاب نہ آ لے۔''

اور سورۃ الشعراء میں ارشاد فرمایا:

﴿قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۝۱۵۵ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝۱۵۶﴾

''کہا کہ یہ اونٹنی ہے ایک دن اس کے لیے پینے کا دن ہے اور ایک دن تمہارے لیے پینے کا معلوم دن ہے۔ اور تم اسے برائی سے نہ چھونا کہ کہیں تمہیں ایک بڑے دن کا عذاب نہ آ لے۔''

یہاں سوال صرف یہ ہے کہ تینوں آیات کے آخری حصّہ میں اختلاف واقع ہوا ہے تو اس کی کیا توجیہہ ہے؟ جواباً عرض ہے کہ یہاں مسئلہ بالکل سادہ اور آسان ہے۔ عذاب کا دردناک ہونا اور عذاب کے قریب ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ سورۂ ہود میں اس کے قریب ہونے کا تذکرہ ہے اور وہ اس لیے کہ اس سورت میں قومِ ہود کو کہا گیا تھا: ﴿فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ۭ﴾ (آیت ۶۵) ''اور اپنے گھروں میں تین دن اور مزے لے لو''۔ یہ مہلت بہت مختصر تھی اس لیے عذابِ قریب کہا گیا۔ اور سورۃ الشعراء میں ''عظیم'' کی صفت عذاب کی نہیں بلکہ دن کی ہے یعنی وہ دن بہت ہولناک ہوگا۔ تو پھر کوئی اشکال باقی نہ رہا۔

(۱۳۵) **آیت** ۷۸: (قومِ ثمود کے بیان میں) اور **آیت** ۹۱: (قومِ شعیب کے بیان میں)

﴿فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝۷۸﴾

''پس ان کو زلزلے نے آگھیرا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے کے اوندھے پڑے رہ گئے۔''

اور سورۂ ہود میں بھی ان کے لیے ''دار'' کا لفظ استعمال ہوا:

﴿فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ۭ﴾ (آیت ۶۵)

''تو انہوں نے اس کے پاؤں کاٹ ڈالے تو صالحؑ نے کہا کہ اپنے گھروں میں تین دن مزے لے لو۔''

اور سورۂ ہود ہی میں قومِ شعیب کے تذکرہ میں کہا:

﴿وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝۹۴﴾

''اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا انہیں ایک بڑی چنگھاڑ نے آ لیا تو پھر وہ اپنے گھروں میں اوندھے کے

اوندھے رہ گئے۔‘‘

اور ایسے ہی آیت ۶۷ میں قومِ صالح کے بارے میں یہی الفاظ لائے گئے۔

سوال یہ ہے کہ پہلی آیت میں عذاب کے لیے ’’الرَّجْفَةُ‘‘ کا لفظ اور ان کی بستی کے لیے ’’دَارِهِمْ‘‘ مفرد کے صیغہ کے ساتھ لایا گیا اور ایسے ہی سورۂ ہود کی آیت میں بھی‘ اور پھر دوسری آیت میں عذاب کے لیے ’’الصَّيْحَةُ‘‘ کا لفظ اور ان کی بستی کے لیے ’’دِيَارِهِمْ‘‘ جمع کے صیغے کے ساتھ لایا گیا‘ تو اس کی کیا وجہ ہے؟

جواباً عرض ہے کہ لفظ ’’دار‘‘ (مفرد کے صیغے کے ساتھ) کا اطلاق ایک گھر یا ایک مکان پر بھی ہوتا ہے اور قبیلے کے تمام گھروں اور مکانات پر بھی ہوتا ہے‘ چاہے وہ کتنے وسیع ہی کیوں نہ ہوں اور چاہے وہ دور دور پھیلے ہوئے بھی ہوں‘ بشرطیکہ علاقہ ایک ہی ہو اور وہ ایک ہی نظم کے تابع ہوں۔

اب ملاحظہ کیجیے کہ سورۃ ہود میں قومِ شعیب پر جو عذاب نازل ہوا تھا اس کے لیے لفظ ’’اَلصَّيْحَةُ‘‘ (چنگھاڑ) آیا ہے جو کہ ایک عمومی لفظ ہے‘ اور جس میں عذاب کا ایک مطلق تصوّر پایا جاتا ہے‘ کسی ایک خاص صنف عذاب کا نام نہیں ہے۔ اس لحاظ سے اس کی عمومیت کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے ’’دِيَار‘‘ (جمع کے صیغے کے ساتھ) کا لایا جانا زیادہ مناسب تھا۔ اور جہاں تک ’’اَلرَّجْفَةُ‘‘ کا تعلق ہے تو اس کا مطلب ہے ’’زلزلہ‘‘ اور یہ عذاب کی ایک خاص صنف ہے اور یہاں عمومیت نہیں بلکہ جزئیت کا اظہار ہو رہا ہے اور اس لحاظ سے اس کے ساتھ ’’دَار‘‘ بصیغہ مفرد لانا مناسب تھا۔

یہ تو دونوں الفاظ کی مناسبت کا بیان تھا‘ لیکن اس بات کا خیال رہے کہ گو ’’اَلصَّيْحَةُ‘‘ کا لفظ عام ہے لیکن جب سورۃ الاعراف کی آیت میں اس کی تفسیر بطور ’’الرَّجْفَةُ‘‘ ہو گئی تو ہمیں یہ کہنا پڑے گا کہ یہ عذاب زلزلے کا عذاب تھا۔ ایک اور بات بھی ملاحظہ ہو کہ سورۂ ہود میں جہاں ’’دِيَار‘‘ جمع کا صیغہ لایا گیا ہے وہاں قومِ شعیب کے جرائم اور ان کی حجت بازیوں کا ایک تفصیلی بیان ہوا ہے جو کہ سورۃ الاعراف میں بیان نہیں ہوا۔

سورۃ الاعراف میں یہ قصہ سات آیات میں اور سورۂ ہود کی بارہ آیات میں بیان ہوا ہے۔ سورۂ ہود کی آیت ۸۴ سے قومِ شعیب کا تذکرہ شروع ہوتا ہے۔ شعیب علیہ السلام نے انہیں اللہ پر ایمان لانے اور ناپ تول میں کمی کرنے پر تنبیہہ کی کہ آمدنی چاہے کم ہو لیکن حلال ہو تو وہ بہتر ہے۔ قومِ شعیبؑ نے طنزیہ انداز میں جواب دیا کہ کیا تمہاری نماز ہمیں ان کاموں سے روکتی ہے جو ہمارے آباء و اَجداد کیا کرتے تھے؟ شعیب علیہ السلام نے جواباً کہا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کھلی کھلی دلیل لے کر آئے ہیں‘ اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جس چیز سے وہ لوگوں کو روک رہے ہیں وہ خود ہی کرنا شروع کر دیں‘ وہ تو صرف اصلاحِ احوال کے درپے ہیں۔ پھر ان کو ان کی نافرمانی کی بنا پر عذاب کے آنے سے ڈرایا‘ توبہ و استغفار کی ہدایت کی۔ قومِ شعیب نے ڈھٹائی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اگر تمہارا قبیلہ نہ ہوتا تو ہم تمہیں سنگسار کر دیتے۔ شعیب علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی طاقت اور جبروت کا حوالہ دیا کہ تم قبیلے کا لحاظ کرتے ہو لیکن اللہ سے نہیں ڈرتے؟ اور پھر آخری دو آیات (۹۴۔۹۵) میں عذابِ ’’الصَّيْحَة‘‘ کے آنے کا ذکر کیا جس نے

ان کی تمام بستیوں (دِیَارِھِمْ) کو آلیا۔

اس تفصیل سے یہ واضح ہوا کہ سورۂ ہود میں یہ قصہ تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ ایک طرف شعیب علیہ السلام کے ناصحانہ الفاظ ہیں تو دوسری طرف ان کی قوم کے تیز و تند خطابات ہیں' اس لیے مناسب تھا کہ یہاں عذاب کے لیے ایک عمومی لفظ (الصَّیْحَۃ) لایا جاتا اور عذاب کی شمولیت کے لیے ان کی تمام بستیوں (دِیَارِھِمْ) کا تذکرہ کیا جاتا۔ سورۃ الاعراف میں اختصار تھا تو اس کی رعایت کرتے ہوئے عذاب کے لیے ایک خصوصی لفظ (الرَّجْفَۃُ) اور ان کی بستیوں کے لیے (دَارِھِمْ) مفرد کے صیغے کے ساتھ لایا گیا۔

یہاں ایک دوسرا جواب بھی دیا جا سکتا ہے کہ سورۃ الشعراء کی آیت ۱۸۹ میں قومِ شعیبؑ پر جو عذاب آیا تھا اسے ''عَذَابُ یَوْمِ الظُّلَّۃِ'' (سائبان کے دن کے عذاب) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ گویا ان پر تین طرح کا عذاب آیا۔ جس میں زلزلہ' چنگھاڑ اور پھر آسمان سے بادِ سموم کا عذاب جو کہ ایک سائبان کی طرح ان کی بستیوں پر تنا ہوا نظر آتا تھا۔ یعنی قومِ فرعون کی طرح ان پر کئی قسم کے عذاب آئے' قومِ فرعون پر جو عذاب آئے ان کا تذکرہ سورۃ الاعراف کی آیت ۱۳۳ میں کیا گیا ہے اور وہ ہیں: طوفان' ٹڈی دَل' جوؤں اور مینڈکوں کا کثرت سے ہونا اور خون ہی خون دکھائی دیا جانا۔ وغیرہ۔

(۱۳۶) **آیت ۷۹**: (بابت صالح علیہ السلام)

﴿فَتَوَلّٰی عَنْھُمْ وَقَالَ یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُکُمْ رِسَالَۃَ رَبِّیْ وَنَصَحْتُ لَکُمْ وَلٰکِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِیْنَ ﴿۷۹﴾﴾

''پھر وہ ان سے پیچھے ہٹ گئے اور کہا: اے میری قوم! میں نے تمہیں اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا ہے' اور میں نے تمہاری خیر خواہی کی' لیکن تم خیر خواہوں کو پسند نہیں کرتے۔''

اور پھر اسی سورت میں شعیب علیہ السلام کے قصے کے ضمن میں ارشاد فرمایا:

﴿اَلَّذِیْنَ کَذَّبُوْا شُعَیْبًا کَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْھَا ۚ اَلَّذِیْنَ کَذَّبُوْا شُعَیْبًا کَانُوْا ھُمُ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۹۲﴾ فَتَوَلّٰی عَنْھُمْ وَقَالَ یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُکُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَنَصَحْتُ لَکُمْ ۚ فَکَیْفَ اٰسٰی عَلٰی قَوْمٍ کٰفِرِیْنَ ﴿۹۳﴾﴾

''جن لوگوں نے شعیب (علیہ السلام) کو جھٹلایا وہ ایسے ہو گئے جیسے کہ وہ کبھی وہاں بسے ہی نہ تھے۔ جن لوگوں نے شعیب (علیہ السلام) کو جھٹلایا وہی خسارے میں رہے۔ پھر وہ ان سے پیچھے ہٹ گئے اور کہا کہ اے میری قوم! میں نے تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیے اور تمہاری خیر خواہی کی' تو میں (اب) اس کافر قوم پر افسوس کیوں کروں!''

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صالح علیہ السلام کی زبان پر ''رِسَالَۃَ رَبِّیْ'' (میرے رب کا پیغام) مفرد کے صیغے کے ساتھ اور شعیب علیہ السلام کی زبان پر ''رِسٰلٰتِ رَبِّیْ'' (میرے رب کے پیغامات) جمع کے صیغے کے ساتھ آیا ہے' حالانکہ دونوں رسول ہیں اور رسالت کے ابلاغ کے لحاظ سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں ہی اللہ

تعالیٰ کی وحدانیت کی دعوت دے رہے ہیں‘ اللہ تعالیٰ کے اوامر اور نواہی بتا رہے ہیں‘ اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر اُبھار رہے ہیں‘ اپنی قوموں کو نجات کا راستہ بتا رہے ہیں اور ان راستوں سے خبردار کر رہے ہیں جو ہلاکت کی طرف لے جاتے ہیں۔

جواباً عرض ہے کہ عربوں کا قاعدہ ہے کہ جہاں سوال میں ایجاز و اختصار ہو تو جواب بھی مختصر ہوتا ہے‘ جہاں طوالت ہو تو جواب بھی طویل و عریض ہوتا ہے‘ اور بعض دفعہ ایسا لفظ استعمال ہوتا ہے جس میں معانی کا سمندر پنہاں ہوتا ہے۔ اب دیکھئے کہ شعیب علیہ السلام کی دعوت میں کتنی تفصیل ہے۔ آیت ۸۵ سے اس قصے کا آغاز ہوتا ہے۔ انہوں نے توحید باری تعالیٰ سے اپنی دعوت کا آغاز کیا‘ پھر ناپ تول میں کمی کرنے پر ان کی سرزنش کی‘ زمین میں فساد کرنے سے روکا‘ فسادیوں کے انجام سے ڈرایا کہ جس میں راستے پر بیٹھ کر لوگوں کو دعوتِ حق سے روکنا بھی شامل ہے۔ انہیں یاد دلایا کہ اللہ تعالیٰ کے احسان کو یاد کرو کہ تم قلیل تھے لیکن اللہ نے اسے کثرت میں بدل دیا۔ پھر قومِ شعیب کی ہٹ دھرمی کا ذکر کیا جب انہوں نے شعیب علیہ السلام کو دھمکی دی تھی کہ یا تو تم ہمارے طور طریقوں میں لوٹ آؤ وگرنہ ہم تمہیں باہر نکال پھینکیں گے۔ اب اس ساری طویل و عریض حکایت کے جواب میں کیا یہ مناسب نہ تھا کہ شعیب علیہ السلام یہ الفاظ ادا کرتے: ’’لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ‘‘ کہ میں نے تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیے ہیں۔

اس کے بالمقابل صالح علیہ السلام کے قصے میں پہلے تو عبادتِ الٰہی کی طرف دعوت ہے‘ پھر اونٹنی کی دیکھ بھال کا تذکرہ ہے اور پھر یہ یاد دلایا گیا ہے کہ تمہیں قومِ عاد کے بعد خلیفہ بنایا گیا۔ گویا وہ ساری تفصیل نہیں جو شعیب علیہ السلام کے قصے میں بیان کی گئی تھی۔ اس ضمن میں کافروں کا یہ کہنا کہ ہم ان چیزوں کا انکار کرتے ہیں جن پر تم ایمان لاتے ہو یا صالح علیہ السلام کو دھمکی دینا کہ اگر تم واقعی نبی ہو تو جس چیز کا ڈراوا دے رہے ہو اسے لے آؤ! تو ان کی یہ باتیں قومِ شعیب کے قصے میں وارد سرزنش سے بہت کم ہیں‘ اس لیے یہاں ’’لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ‘‘ بصیغہ افراد لانا مناسب تھا۔

اب اگر یہ کہا جائے کہ اسی سورت میں نوح اور ہود علیہما السلام کے قصے میں بھی دونوں پیغمبروں کی زبان سے ’’اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ‘‘ (آیت ۶۲ اور ۶۸) بصیغہ جمع کہا گیا ہے اور دونوں قصوں میں نہ طوالت ہے نہ ہی تفصیل ہے کہ جس کی بنا پر جمع کا صیغہ لایا جاتا ہے‘ تو اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں قصوں میں کُفّار کی طرف سے ایسی بات کہی گئی ہے جو خود بہت سے الزامات کا مجموعہ بن جاتی ہے۔ قومِ نوحؑ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا: ﴿قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝۶۰﴾ ’’اور ان کی قوم کے سرداروں نے کہا کہ ہم تمہیں کھلی کھلی بھٹکنے کی حالت میں دیکھتے ہیں‘‘۔ اور قومِ ہود نے ہود علیہ السلام کو کہا تھا: اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ (آیت ۶۶) ’’ہم یقیناً تمہیں کم عقلی میں دیکھتے ہیں۔‘‘

یہاں ضَلَال اور سَفَاهَةٍ کے الفاظ میں وہ کچھ معانی پنہاں ہیں جو کہ قومِ نوح نے نوح علیہ السلام کو تفصیلاً کہے

تھے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ لفظ ضَلَال (گم کردہ راہ) کا اطلاق اپنی عمومیت کے اعتبار سے کئی باتوں پر ہوسکتا ہے‘ جن میں نوح علیہ السلام کی اپنی قوم کو نصیحت‘ انہیں معروف کا حکم دینا‘ منکر سے روکنا‘ آخرت کے عذاب سے ڈرانا‘ سب شامل ہیں۔ گویا یہ ساری باتیں قومِ نوحؑ کے نزدیک ان کے گم کردہ راہ ہونے پر دلالت کرتی تھیں۔

زمخشری کہتے ہیں کہ ضَلَال کا مطلب ہے: حق اور سچائی کے راستے کو گم کر دینا۔ گویا وہ نوح علیہ السلام سے یہ کہہ رہے تھے کہ ہم تمہاری کسی بات کو کیوں مانیں‘ کیونکہ تم تو صحیح راستے سے خود بھٹک چکے ہو۔ خود نوح علیہ السلام کا جواب ’’لَيْسَ بِيْ ضَلَالَةٌ‘‘ (مجھ میں راہ سے ہٹنے کی کوئی بات نہیں) ان کے تمام اقوال کی تردید کرتا ہے۔ دیکھئے انہوں نے اپنے جواب میں ’’لَيْسَ بِيْ ضَلَالٌ‘‘ نہیں کہا بلکہ ’’ضَلَالَةٌ‘‘ کہا‘ جس میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ تمہارے جتنے بھی الزامات ہیں‘ چاہیں تھوڑے ہوں یا زیادہ‘ سب کے سب فضول اور بے کار ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ایک شخص دوسرے شخص سے سوال کرے: اَلَكَ تَمْرٌ ؟ (کیا تمہارے پاس کھجور ہے) تو وہ جواباً کہے : لَا وَلَا تَمْرَةٌ (نہیں‘ ایک کھجور بھی نہیں)۔ اور پھر یہ بھی ملاحظہ ہو کہ وہ اپنی قوم میں ایک طویل مدت تک رہے‘ یہاں تک کہ ان کی قوم نے ان پر یہ پھبتی بھی کسی: ﴿قَدْ جَادَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا﴾ ’’تم نے ہم سے حجت بازی کی اور بہت زیادہ کی‘‘۔ اور پھر نوح علیہ السلام یہ کہنے پر مجبور ہوئے: ﴿اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ﴾ ’’میں نے تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیے‘‘۔ گویا وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ ہر وہ بات جو میں نے تم سے کہی اور ہر وہ پیغام جو میں نے تمہیں پہنچایا وہ بالکل محفوظ حالت میں تھا کہ اللہ نے میری حفاظت کا ذمہ لیا ہے اور جو تم سمجھتے ہو کہ میں راہِ حق سے بھٹک گیا ہوں تو ایسا نہیں ہے۔ اور پھر مزید یہ الفاظ کہے: ﴿وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝﴾ ’’اور میں تمہارا خیر خواہ ہوں اور میں اللہ کی جانب سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے‘‘۔ اور اس طرح ان کے تمام الزامات کا جواب ایک لطیف انداز میں دے دیا۔

ایک دفعہ پھر اس کا تقابل قومِ صالح کی بات چیت سے کرلیں۔ وہاں صرف دو باتوں کا تذکرہ ملتا ہے‘ ایک تو یہ کہ انہوں نے ایمان لانے والوں سے یہ کہا تھا: ﴿اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ﴾ (الاعراف: ۷۵) ’’کیا تمہیں یقین ہے کہ صالح اپنے ربّ کی طرف سے بھیجا گیا ہے؟‘‘ یعنی سوال ان کی رسالت کی صحت کے بارے میں تھا۔ اور پھر بڑی ڈھٹائی سے کہا: ﴿اِنَّا بِالَّذِيْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝﴾ ’’جس پر تم ایمان لائے ہو ہم تو اس کا انکار کرتے ہیں‘‘۔ اور پھر ان کا اسی بنیاد پر اونٹنی کو ہلاک کرنا تھا۔ چونکہ یہاں سارے کا سارا استدلال ان کی رسالت کے انکار پر مبنی تھا‘ اس لیے صالح علیہ السلام کا ’’اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ‘‘ (میں نے اپنے رب کا پیغام (بصیغہ مفرد) تمہیں پہنچا دیا) کہنا بالکل مناسب تھا۔

ہود علیہ السلام کی قوم نے ان کے لیے ’’فِيْ سَفَاهَةٍ‘‘ (کم عقلی میں ہونا) کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ ’’سَفَاهَةٍ‘‘ سے مراد ہے جلد بازی‘ بردباری کا نہ ہونا‘ اور یہ لفظ بھی ’’فِيْ ضَلَالٍ‘‘ کے ہم مرتبہ ہے‘ کہ جو شخص یہ وصف رکھتا ہے اس پر کیسے اعتماد کیا جاسکتا ہے؟ اس لیے ہود علیہ السلام کی زبان سے بھی ان کی تردید میں ’’رِسٰلٰتِ رَبِّيْ

’’ کے الفاظ ادا ہوئے۔ یعنی مفرد کا صیغہ اپنی جگہ پر اور جمع کا صیغہ اپنی جگہ پر مناسب تھا۔ واللہ اعلم!

کلمہ ’’ضَلَال‘‘ کے بارے میں مزید وضاحت

پچھلی سطور میں اس بات کو بیان کیا گیا ہے کہ ’’ضلال‘‘ کا اطلاق ’’کفر‘‘ سے کم امور پر ہوتا ہے۔ گو اس کلمہ میں کفر کو چھوڑ کر کئی دوسری بے ہودہ باتیں آ جاتی ہیں‘ اس لیے بعض دفعہ اس کا اطلاق اہل ایمان پر بھی کیا جاتا ہے جو کہ کفر سے بریٔ الذّمہ ہوتے ہیں۔ جیسے یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے جب یہ دیکھا کہ ان کے والد یعقوب علیہ السلام انہیں بھائیوں پر فوقیت دے رہے ہیں تو ان کے بارے میں یہ کہا: ﴿اِنَّ اَبَانَا لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝۸﴾ (یُوسف) ’’بے شک ہمارا باپ کھلی کھلی غلطی میں ہے‘‘۔ اور پھر جب یہی بھائی یوسف علیہ السلام کا کُرتا لے کر آ رہے تھے تو یعقوب علیہ السلام نے اپنے وجدان سے یہ کہا تھا کہ مجھے یوسف کی خوشبو آ رہی ہے‘ اور گھر والوں نے پھر کہا: ﴿قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِیْ ضَلٰلِكَ الْقَدِیْمِ ۝۹۵﴾ (یُوسف) ’’انہوں نے کہا: اللہ کی قسم بے شک آپ ابھی تک اپنے پرانے خبط میں مبتلا ہیں‘‘۔ اور قرآن کریم میں اس کی اور مثالیں بھی ملیں گی۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اللہ کے رسولوں نے جب پہلے پہل اپنی قوموں کو اللہ کی طرف بلایا تو انہوں نے نرمی اور کمال لطف وعنایت سے کلام کیا‘ صبر کا مظاہرہ کیا۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون سے خطاب کرتے وقت کہا تھا: ﴿فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّیِّنًا﴾ (طٰہٰ:۴۴) ’’تم دونوں (موسیٰ اور ہارون) اس سے نرمی سے خطاب کرنا‘‘۔ اور عام طور پر قوموں کا جواب بھی اسی اعتبار سے ہلکی نوعیت کا تھا۔

دیکھئے کہ قومِ نوح نے شروع شروع میں تو نوح علیہ السلام کو صرف اتنا ہی کہا تھا: ﴿اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ۝۱۱۱﴾ (الشعراء) ’’کیا ہم تم پر ایمان لے آئیں جبکہ تمہاری پیروی کرنے والے نیچ لوگ ہیں‘‘۔ یعنی ان کے خیال میں معاشرے کے کمترین طبقے کے لوگ اگر کسی چیز پر ایمان لے آئیں تو ان کا تکبر اسے قبول کرنے سے انکار کر دے گا۔ اسی بات کو سورۃ الانعام میں یوں بیان کیا گیا ہے: ﴿اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنْۢ بَیْنِنَا ؕ﴾ (آیت ۵۳) ’’کیا یہی وہ لوگ ہیں ہمارے درمیان جن پر اللہ نے اپنا فضل کیا ہے؟‘‘ اور سورۃ الاحقاف میں کُفّار کا یہ ردّعمل ظاہر کیا گیا ہے: ﴿لَوْ كَانَ خَیْرًا مَّا سَبَقُوْنَاۤ اِلَیْهِ ؕ﴾ (آیت ۱۱) ’’اگر یہ اچھی بات ہوتی تو یہ لوگ اسے اپنانے میں ہم پر سبقت کیوں حاصل کرتے!‘‘ ان الفاظ میں تکذیب کی صراحت نہیں ہے‘ گو ارادہ تکذیب ہی کا ہے۔ اور ایسے ہی قومِ نوح کا یہ کہنا: ﴿مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا﴾ ’’ہم تمہیں اپنے جیسا ایک بشر دیکھتے ہیں‘‘۔ تکذیب کا مرحلہ بالکل آخر میں آتا ہے‘ جیسا کہ سورۂ یوسف میں ارشاد فرمایا:

﴿حَتّٰۤی اِذَا اسْتَیْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا﴾ (آیت ۱۱۰)

’’یہاں تک کہ جب رسول بالکل مایوس ہو گئے اور (کُفّار نے) گمان کیا کہ (اللہ کا عذاب آنے کے بارے میں) ان سے جھوٹ کہا گیا تھا‘ ہماری مدد آ پہنچی۔‘‘

اور سورۃ الزخرف میں اسی آخری مرحلے کے انجام کا ذکر کیا گیا: ﴿فَلَمَّا اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ﴾ (آیت ۵۵) ''جب ان لوگوں نے ہمیں غصہ دلایا تو ہم نے ان سے انتقام لیا''۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ انبیاء و رسل علیہم السلام کی دعوت میں تدریج پائی جاتی ہے جس کا اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت میں واضح طور پر مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ اور اس سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ قومِ نوح کا پہلا ردِّعمل ان الفاظ سے تھا: ﴿اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝۶۰﴾ یا یہ کہنا: ﴿بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ۝۶۶﴾ (ھود) ''بلکہ ہم تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں''۔ لیکن آخر میں ڈھٹائی پر اتر آئے: ﴿قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا﴾ (ھود:۳۲) ''تم نے ہم سے حجت بازی کی اور خوب کی''۔ تو اس تفصیل سے ظاہر ہوگیا کہ شروع میں ان کی زبان پر ''ضلال'' اور ''جھوٹے'' ہونے کے گمان کا تذکرہ آیا۔ صاف صاف کاذب اور کافر نہ کہا تھا اور ''ضَلَال'' کے ضمن میں گو کئی الزامات آگئے تھے لیکن ان کی دعوت کو صراحتاً جھٹلانے کا بیان نہ تھا۔

اُمید ہے کہ اس وضاحت سے کلمہ ''ضلال'' کے مقصود اور مطلوب کا تعین ہوجائے گا۔ واللہ سبحانہ اعلم!

مترجم کتاب کا کلمہ ''ضَلَال'' کے بارے میں توضیحی نوٹ

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ''ضلال'' کے مختلف معانی کو یہاں یکجا کر دیا جائے تاکہ اس کے بارے میں کوئی ابہام نہ رہے۔ بعض کلمات کے لغوی معنی اور اصطلاحی شرعی معنی میں گہری مناسبت ہوتی ہے لیکن وہ شرعی اصطلاح میں زیادہ معروف ہوجاتے ہیں، جیسے لفظ ''بدعت'' ہے، لغوی اعتبار سے اس کا مطلب ہے: کوئی بھی نئی چیز۔ سورۃ الاحقاف میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں کہا گیا: ﴿قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ﴾ (آیت ۹) ''کہہ دیجیے کہ میں رسولوں میں کوئی نیا نہیں ہوں''۔ اور پھر قولِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ((كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَة)) کے تحت بدعت کا معنی متعین ہوگیا اور وہ ہے ''احداث فی الدین'' یعنی دین میں کوئی نئی بات پیدا کرنا۔ ایسے ہی لفظ ضلال قرآن میں کئی معانی میں مستعمل ہوا ہے جیسے: بمعنی غفلت یا لاعلمی۔ سورۃ والضحیٰ میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ارشاد ہوا: ﴿وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝۷﴾ ''اور آپؐ کو (شریعت کے بارے میں) غافل اور لاعلم پایا تو ہدایت عطا کی''۔ اور اس معنی کی تائید سورۃ الشوریٰ کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے: ﴿مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ﴾ (آیت ۵۲) ''اور آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے''۔ اور سورۂ یوسف کی اس آیت سے بھی: ﴿وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝۳﴾ ''اگرچہ آپ اس سے پہلے غافلوں میں سے تھے''۔ اور سورۃ النساء کی اس آیت سے بھی: ﴿وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۭ﴾ (آیت ۱۱۳) ''اور اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت کو اتارا اور تمہیں وہ کچھ سکھایا جو تم نہیں جانتے تھے''۔

ضلال کا یہی معنی مندرجہ ذیل آیات سے بھی متعلق ہے۔ سورۃ البقرۃ میں جہاں دو عورتوں کی گواہی کا ذکر

ہے وہاں اس کی حکمت یوں بیان ہوئی ہے: ﴿اَنۡ تَضِلَّ اِحۡدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحۡدٰىهُمَا الۡاُخۡرٰى ؕ﴾ (آیت ۲۸۲) ''تاکہ اگر ایک غفلت کی شکار ہو تو دوسری اس کو یاد دلا دے''۔ اور سورۂ طٰہٰ کی اس آیت میں: ﴿لَا يَضِلُّ رَبِّىۡ وَلَا يَنۡسَى ۝۵۲﴾ ''اور میرا رب نہ غافل ہوتا ہے اور نہ ہی بھولتا ہے۔''

ضلال کا ایک مطلب یہ بھی ہے: چھپ جانا' غائب ہو جانا۔ سورۃ السجدۃ میں کُفّار کا یہ قول نقل کیا گیا: ﴿وَقَالُوۡۤا ءَاِذَا ضَلَلۡنَا فِى الۡاَرۡضِ﴾ (آیت ۱۰) ''اور انہوں نے کہا کہ کیا ہم جب زمین میں غائب ہو جائیں گے''۔ اور اسی قبیل سے لغت میں کہا جاتا ہے: ''ضَلَّ الْمَاءُ فِی اللَّبَنِ'' پانی دودھ میں غائب ہو گیا۔

''ضلال'' بمعنی حیرت بھی استعمال ہوتا ہے' سورۃ والضحیٰ کی آیت کی یہ تفسیر بھی کی گئی ہے کہ ''تمہیں حیرت زدہ پایا تو ہدایت کی''۔ وہ ایسے ہی ہے جیسے ایک شخص ایک اجنبی مقام پر ایک چوراہے پر کھڑا ہو' حیرت اور استعجاب سے چاروں طرف دیکھتا ہو کہ کس طرف جاؤں اور ایسے میں کوئی شخص اسے سیدھا راستہ دکھا دے۔

اب آیئے ضلال کے آخری مرحلہ کی طرف' اور وہ یہ کہ آدمی ہدایت یافتہ ہو اور پھر وہ گمراہ ہو جائے یا گمراہ کر دیا جائے' اور یہی معنیٰ اکثر آیات میں لیا گیا ہے' جیسے ﴿وَلَا الضَّآلِّيۡنَ ۝﴾ (الفاتحہ) ''اور نہ ہی گمراہوں کا راستہ''۔ سورۃ الفرقان میں ارشاد فرمایا:

﴿وَيَوۡمَ يَحۡشُرُهُمۡ وَمَا يَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ فَيَقُوۡلُ ءَاَنۡتُمۡ اَضۡلَلۡتُمۡ عِبَادِىۡ هٰٓؤُلَآءِ اَمۡ هُمۡ ضَلُّوا السَّبِيۡلَ ۝۱۷﴾

''اور جس دن وہ انہیں ان کے ساتھ اکٹھا کر دے گا جنہیں وہ اللہ کے سوا پوجتے تھے اور پھر کہے گا کہ کیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا تھا یا وہ خود راستہ کھو بیٹھے تھے؟''

اور سورۃ المائدۃ میں ارشاد فرمایا:

﴿قُلۡ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لَا تَغۡلُوۡا فِىۡ دِيۡنِكُمۡ غَيۡرَ الۡحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوۡۤا اَهۡوَآءَ قَوۡمٍ قَدۡ ضَلُّوۡا مِنۡ قَبۡلُ وَاَضَلُّوۡا كَثِيۡرًا وَّضَلُّوۡا عَنۡ سَوَآءِ السَّبِيۡلِ ۝۷۷﴾

''کہہ دیجیے اے اہل کتاب! اپنے دین میں ناحق غلومت کرو اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو جو پہلے گمراہ ہو چکے ہیں اور بہت سے لوگوں کو گمراہ بھی کر چکے ہیں اور سیدھے راستے سے خود بھی بھٹک چکے ہیں۔''

گویا ''ضَلَّ'' کا اصل معنیٰ سیدھی راہ سے بھٹک جانا ہے' اور اصطلاحی مفہوم میں دینِ حق سے بھٹکنا مراد ہے' اور اس کے مقابلے میں ہدایت سے مراد دینِ حق کی طرف ہدایت پانا ہے۔

میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

ترجمۂ قرآن مجید

مع صرفی ونحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم

ترتیب وتدوین: لطف الرحمٰن خان مرحوم

سُورۃ یُونس

آیات ۱ تا ۱۰

﴿الٓرٰ ۟ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۝۱ اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ۝۲ اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۳ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۝۴ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝۵ اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ ۝۶ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ۝۷ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝۸ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ ۚ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝۹ دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۰﴾

ترکیب

(آیت ۲) کَانَ کا اسم اس میں شامل هُوَ کی ضمیر ہے اور عَجَبًا اس کی خبر ہے۔ اَنَّ کا اسم قَدَمَ صِدْقٍ ہے' اس لیے اس کے مضاف قَدَمَ پر نصب آئی ہے۔ اس کی خبر وَاجِبٌ یا ثَابِتٌ محذوف ہے اور لَهُمْ قائم مقام خبر ہے۔ (آیت ۴) وَعْدَ اللّٰهِ کی نصب بتا رہی ہے کہ اس سے پہلے اِنَّ محذوف ہے۔ اس کی خبر بھی محذوف ہے جو ثَابِتٌ یا وَاجِبٌ ہو سکتی ہے۔ حَقًّا حال ہے۔ (آیت ۶) اِنَّ کا اسم ہونے کی وجہ سے لَایٰتٍ حالتِ نصب میں ہے' اس کی خبر مَوْجُوْدٌ محذوف ہے' اور فِی اخْتِلَافِ سے لے کر وَالْاَرْضِ تک قائم مقام خبر ہے۔ (آیت ۱۰) دَعْوٰىهُمْ سے پہلے یَکُوْنُ محذوف ہے اور یہ کَانَ تامہ ہے۔ دَعْوٰىهُمْ اس کا فاعل ہے اور محلاً حالت رفع میں ہے۔ فِیْهَا کی ضمیر جَنّٰتِ النَّعِیْمِ کے لیے ہے۔ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ سے پہلے بھی کَانَ تامہ کا یَکُوْنُ محذوف ہے اور اس کا فاعل ہونے کی وجہ سے اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ کے مضاف اٰخِرُ پر رفع آئی ہے۔

ترجمہ:

الٓرٰ : ا۔ل۔ر	تِلْكَ : یہ
اٰیٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِیْمِ : حکمت والی کتاب کی آیات ہیں	اَكَانَ : کیا یہ ہوا
لِلنَّاسِ : لوگوں کے لیے	عَجَبًا : عجیب
اَنْ اَوْحَیْنَآ : کہ وحی کیا ہم نے	اِلٰی رَجُلٍ : ایک شخص کی طرف
مِّنْهُمْ : ان میں سے	اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ : کہ تو خبردار کر لوگوں کو
وَبَشِّرِ : اور خوشخبری دے	الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا : ان لوگوں کو جو ایمان لائے
اَنَّ لَهُمْ : کہ ان کے لیے ہے	قَدَمَ صِدْقٍ : سچائی کا رتبہ
عِنْدَ رَبِّهِمْ : ان کے رب کے پاس	قَالَ الْكٰفِرُوْنَ : تو کہا کافروں نے
اِنَّ هٰذَا : بے شک یہ (تو)	لَسٰحِرٌ مُّبِیْنٌ : یقیناً ایک کھلا جادوگر ہے
اِنَّ رَبَّكُمُ : بے شک تم لوگوں کی پرورش کرنے والا	اللّٰهُ الَّذِیْ : وہ اللہ ہے جس نے
خَلَقَ السَّمٰوٰتِ : پیدا کیا آسمانوں کو	وَالْاَرْضَ : اور زمین کو
فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ : چھ دنوں میں	ثُمَّ اسْتَوٰی : پھر وہ متمکن ہوا
عَلَی الْعَرْشِ : عرش پر	یُدَبِّرُ الْاَمْرَ : وہ تدبیر کرتا ہے تمام معاملات کی
مَا مِنْ شَفِیْعٍ : نہیں ہے کوئی بھی شفاعت کرنے والا	اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ : مگر اس کی اجازت کے بعد

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ : یہ اللہ تم لوگوں کی پرورش کرنے والا ہے

فَاعْبُدُوْهُ : پس تم اس کی بندگی کرو

اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ : تو کیا تم نصیحت نہیں حاصل کرتے

اِلَيْهِ : اس کی طرف ہی

مَرْجِعُكُمْ : تمہیں لوٹنا ہے

جَمِيْعًا : سب کے سب کو

وَعْدَ اللّٰهِ : (بے شک) اللہ کا وعدہ (ثابت) ہے

حَقًّا : حق ہوتے ہوئے

اِنَّهٗ يَبْدَؤُا : بے شک وہ ابتدا کرتا ہے

الْخَلْقَ : پیدا کرنے کی

ثُمَّ يُعِيْدُهٗ : پھر وہ دوبارہ (پیدا) کرے گا اس کو

لِيَجْزِيَ : تاکہ وہ بدلہ دے

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا : ان لوگوں کو جو ایمان لائے

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ : اور انہوں نے عمل کیے نیک

بِالْقِسْطِ : انصاف سے

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا : اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا

لَهُمْ شَرَابٌ : ان کے لیے پینے کی چیز ہے

مِّنْ حَمِيْمٍ : کھولتے (پانی) سے

وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌ : اور ایک دردناک عذاب ہے

بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ : بسبب اس کے جو وہ لوگ کفر کرتے تھے

هُوَ الَّذِيْ : وہ وہی ہے جس نے

جَعَلَ الشَّمْسَ : بنایا سورج کو

ضِيَآءً : روشنیاں

وَّالْقَمَرَ : اور چاند کو

نُوْرًا : نور

وَّقَدَّرَهٗ : اور اس نے مقرر کیا اس کو

مَنَازِلَ : بلحاظ منزلوں کے

لِتَعْلَمُوْا : تاکہ تم لوگ جان لو

عَدَدَ السِّنِيْنَ : سالوں کی گنتی کو

وَالْحِسَابَ : اور حساب کو

مَا خَلَقَ اللّٰهُ : نہیں پیدا کیا اللہ نے

ذٰلِكَ : یہ

اِلَّا بِالْحَقِّ : مگر حق کے ساتھ

يُفَصِّلُ : وہ کھول کھول کر بیان کرتا ہے

الْاٰيٰتِ : نشانیوں کو

لِقَوْمٍ : ایسے لوگوں کے لیے

يَّعْلَمُوْنَ : جو علم رکھتے ہیں

اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ : یقیناً دن اور رات کے اختلاف میں

وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ : اور اس میں جو پیدا کیا اللہ نے

فِي السَّمٰوٰتِ : آسمانوں میں

وَالْاَرْضِ : اور زمین میں

لَاٰيٰتٍ : ضرور نشانیاں ہیں

لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ : ایسے لوگوں کے لیے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں

اِنَّ الَّذِيْنَ : بے شک جو لوگ

لَا يَرْجُوْنَ : اُمید نہیں رکھتے

لِقَآءَنَا : ہماری ملاقات کی

وَرَضُوْا : اس حال میں کہ وہ راضی ہوئے	بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا : دنیوی زندگی سے
وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا : اور مطمئن ہوئے اس پر	وَالَّذِيْنَ هُمْ : اور وہ لوگ جو
عَنْ اٰيٰتِنَا : ہماری نشانیوں سے	غٰفِلُوْنَ : غفلت برتنے والے ہیں
اُولٰٓئِكَ : یہ ہی لوگ ہیں	مَاْوٰىهُمُ النَّارُ : جن کا ٹھکانہ آگ ہے
بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ : بسبب اس کے جو وہ کماتے تھے	اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا : بے شک جو لوگ ایمان لائے
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ : اور انہوں نے عمل کیے نیک	يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ : ہدایت دے گا ان کو ان کا رب
بِاِيْمَانِهِمْ : ان کے ایمان کی وجہ سے	تَجْرِيْ : بہیں گی
مِنْ تَحْتِهِمُ : ان کے نیچے سے	الْاَنْهٰرُ : نہریں
فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ : نعمتوں کے باغات میں	دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا : ان کا پکارنا اس میں
سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ : (کہ) پاکی تیری ہے اے اللہ	وَتَحِيَّتُهُمْ : اور (ہوگا) ان کا دعا دینا
فِيْهَا سَلٰمٌ : اس میں سلام	وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ : اور (ہوگا) ان کا آخری پکارنا
اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ : کہ تمام شکر و سپاس اللہ ہی کے لیے ہے	رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ : جو تمام جہانوں کا پرورش کرنے والا ہے

نوٹ ۱ : لفظ ضِيَآءٌ میں روشنی کے ساتھ تپش کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے اور نور، خُنُك (یعنی ٹھنڈی) روشنی کو کہتے ہیں اور یہ ایک امر واقعہ ہے کہ سورج کی روشنی میں تپش ہوتی ہے اور چاند کی روشنی ٹھنڈی ہوتی ہے۔ (تدبّرِ قرآن)۔ ضِيَآءٌ لفظ ضَوْءٌ کی جمع ہے۔ اس میں شاید اس طرف اشارہ ہے کہ روشنی کے ساتھ رنگ اور قسمیں جو دنیا میں پائی جاتی ہیں، آفتاب ان تمام اقسام کا جامع ہے جو بارش کے بعد قوسِ قزح میں ظاہر ہوتے ہیں۔ (معارف القرآن)

نوٹ ۲ : شمسی و قمری سال اور مہینے قدیم زمانہ سے معروف ہیں، لیکن چاند کے ذریعے مہینہ اور تاریخ کا حساب مشاہدہ اور تجربہ سے معلوم ہے، جبکہ شمس کی منزلوں کے حسابات سوائے ریاضی والوں کے کوئی دوسرا نہیں سمجھ سکتا۔ اس لیے عوام الناس کی آسانی کی خاطر عموماً احکامِ اسلامیہ میں قمری مہینوں اور تاریخوں کا اعتبار کیا گیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ شمسی حساب رکھنا یا استعمال کرنا ناجائز ہے۔ کوئی شخص اگر نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، عدت وغیرہ میں قمری حساب کو شریعت کے مطابق استعمال کرے، تو پھر اسے اختیار ہے کہ اپنے کاروبار اور تجارت وغیرہ میں شمسی حساب استعمال کرے۔ البتہ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمانوں میں مجموعی طور پر قمری حساب جاری رہے تاکہ رمضان اور حج وغیرہ کے اوقات معلوم ہوتے رہیں۔ ایسا نہ ہو کہ شمسی مہینوں کے علاوہ کوئی مہینہ معلوم ہی نہ ہو۔ اس

لیے قمری حساب کو باقی رکھنا مسلمانوں کے ذمہ فرضِ کفایہ ہے۔ اور یہ سُنّت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ اس کا اتباع باعثِ ثواب اور باعثِ برکت ہے۔ (معارف القرآن)

آیات ۱۱ تا ۲۰

﴿وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ ؕ فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ⑪ وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖۤ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَاۤ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ⑫ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا ۙ وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ⑬ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ⑭ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَاۤ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ⑮ قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَاۤ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ⑯ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ⑰ وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ⑱ وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّاۤ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ⑲ وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا ۚ اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ⑳﴾

ترجمہ

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ : اور اگر جلدی کرتا اللہ	لِلنَّاسِ : لوگوں کے لیے
الشَّرَّ : برائی میں	اسْتِعْجَالَهُمْ : جیسا کہ ان کا جلدی مچانا ہے
بِالْخَيْرِ : بھلائی میں	لَقُضِيَ : تو ضرور پورا کر دیا جاتا
اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ : ان کی طرف ان کی مدت کو	فَنَذَرُ الَّذِيْنَ : تو ہم چھوڑ دیتے ہیں ان لوگوں کو جو

لَا یَرْجُوْنَ : امید نہیں رکھتے
فِیْ طُغْیَانِہِمْ :ان کی سرکشی میں
وَاِذَا مَسَّ :اور جب کبھی چھوتی ہے
الضُّرُّ :تکلیف
لِجَنْبِہٖ :اپنی کروٹ کے بل
اَوْ قَاعِدًا :یا بیٹھے ہوئے
اَوْ قَآئِمًا :یا کھڑے ہوئے
عَنْہُ ضُرَّہٗ :اس سے اس کی تکلیف کو
کَاَنْ لَّمْ یَدْعُنَآ :جیسے کہ اس نے پکارا ہی نہیں ہم کو
مَّسَّہٗ :جس نے چھوا اس کو
زُیِّنَ : مزیّن کیا گیا

مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ :اس کو جو وہ عمل کرتے تھے
الْقُرُوْنَ :زمانوں (کے لوگوں) کو
لَمَّا ظَلَمُوْا :جب انہوں نے ظلم کیا
رُسُلُھُمْ :ان کے رسول
وَمَا کَانُوْا :اور (پھر بھی) وہ نہیں تھے
کَذٰلِکَ :اس طرح
الْقَوْمَ الْمُجْرِمِیْنَ: جرم کرنے والے لوگوں کو
خَلٰٓئِفَ :خلیفہ
مِنْ بَعْدِھِمْ :ان کے بعد سے
کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ : کیسا تم لوگ عمل کرتے ہو

اٰیَاتُنَا بَیِّنٰتٍ: ہماری آیتیں واضح ہوتے ہوئے
لَا یَرْجُوْنَ :اُمید نہیں رکھتے
ائْتِ بِقُرْاٰنٍ :آپؐ لائیں کوئی قرآن

لِقَآءَنَا :ہماری ملاقات کی
یَعْمَھُوْنَ :بھٹکتے ہوئے
الْاِنْسَانَ :انسان کو
دَعَانَا :تو وہ پکارتا ہے ہمیں
اَوْ قَاعِدًا :یا بیٹھے ہوئے
فَلَمَّا کَشَفْنَا :پھر جب ہٹا دیتے ہیں ہم
مَرَّ :تو وہ گزرتا ہے (یعنی چل دیتا ہے)
اِلٰی ضُرٍّ :اس تکلیف کے لیے

کَذٰلِکَ :اس طرح
لِلْمُسْرِفِیْنَ :حد سے تجاوز کرنے والوں کے لیے
وَلَقَدْ اَھْلَکْنَا :اور بے شک ہم نے ہلاک کیا ہے
مِنْ قَبْلِکُمْ :تم لوگوں سے پہلے
وَجَآءَتْھُمْ :حالانکہ آئے ان کے پاس
بِالْبَیِّنٰتِ :واضح (نشانیوں) کے ساتھ
لِیُؤْمِنُوْا :کہ ایمان لاتے
نَجْزِی :ہم بدلہ دیتے ہیں
ثُمَّ جَعَلْنٰکُمْ :پھر ہم نے بنایا تم لوگوں کو
فِی الْاَرْضِ :زمین میں
لِنَنْظُرَ :تاکہ ہم دیکھیں
وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْھِمْ :اور جب بھی پڑھ کر سنائی جاتی ہیں انہیں
قَالَ الَّذِیْنَ :تو کہتے ہیں وہ لوگ جو
لِقَآءَنَا :ہماری ملاقات کی
غَیْرِ ھٰذَآ :اس کے علاوہ

اَوْ بَدِّلْهُ : یا آپؐ تبدیل کریں اس کو	قُلْ مَا یَکُوْنُ لِیْ : آپؐ کہہ دیجیے نہیں ہوگا (ممکن) میرے لیے
اَنْ اُبَدِّلَهٗ : کہ میں تبدیل کروں اس کو	مِنْ تِلْقَآءِ نَفْسِیْ : اپنے نفس کی طرف سے
اِنْ اَتَّبِعُ : میں پیروی نہیں کرتا	اِلَّا مَا : مگر اس کی جو
یُوْحٰٓی اِلَیَّ : وحی کیا جاتا ہے میری طرف	اِنِّیْٓ اَخَافُ : بے شک میں ڈرتا ہوں
اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ : اگر میں نافرمانی کروں اپنے رب کی	عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ : ایک عظیم دن کے عذاب سے
قُلْ لَّوْ : آپؐ کہیے اگر	شَآءَ اللّٰهُ : چاہتا اللہ
مَا تَلَوْتُهٗ عَلَیْکُمْ : تو میں اسے پڑھ کر نہ سناتا تم لوگوں کو	وَلَآ اَدْرٰىکُمْ بِهٖ : اور وہ باخبر نہ کرتا تم کو اس سے
فَقَدْ لَبِثْتُ : تو میں رہ چکا ہوں	فِیْکُمْ : تم میں
عُمُرًا : ایک عمر	مِّنْ قَبْلِهٖ : اس سے پہلے
اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ : تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے	فَمَنْ اَظْلَمُ : پس کون زیادہ ظالم ہے
مِمَّنِ افْتَرٰی : اس سے جس نے گھڑا	عَلَی اللّٰهِ : اللہ پر
کَذِبًا : ایک جھوٹ	اَوْ کَذَّبَ : یا جھٹلایا
بِاٰیٰتِهٖ : اس کی آیتوں کو	اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ : حقیقت یہ ہے کہ فلاح نہیں پاتے
الْمُجْرِمُوْنَ : جرم کرنے والے	وَیَعْبُدُوْنَ : اور وہ بندگی کرتے ہیں
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ : اللہ کے علاوہ	مَا لَا یَضُرُّهُمْ : اس کی جو تکلیف نہیں دیتا ہے ان کو
وَلَا یَنْفَعُهُمْ : اور نہ ہی نفع دیتا ہے ان کو	وَیَقُوْلُوْنَ : اور وہ کہتے ہیں
هٰٓؤُلَآءِ : یہ لوگ	شُفَعَآؤُنَا : شفاعت کرنے والے ہیں ہماری
عِنْدَ اللّٰهِ : اللہ کے پاس	قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ : آپؐ کہیے کیا تم لوگ خبر دیتے ہو اللہ کو
بِمَا لَا یَعْلَمُ : اس کی جو وہ نہیں جانتا	فِی السَّمٰوٰتِ : آسمانوں میں
وَلَا فِی الْاَرْضِ : اور نہ ہی زمین میں	سُبْحٰنَهٗ : پاکیزگی اس کی ہے

وَتَعٰلٰی :اور وہ بلند ہے	عَمَّا یُشْرِکُوْنَ :اس سے جس کو یہ لوگ شریک کرتے ہیں
وَمَا کَانَ النَّاسُ :اور نہیں تھے لوگ	اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً :مگر ایک امت
فَاخْتَلَفُوْا :پھر انہوں نے اختلاف کیا	وَلَوْلَا کَلِمَةٌ :اور اگر نہ ہوتا ایک فرمان
سَبَقَتْ :جو طے ہوا	مِنْ رَّبِّكَ :آپؐ کے رب (کی طرف) سے
لَقُضِیَ بَیْنَهُمْ :تو ضرور فیصلہ کر دیا جاتا ان کے مابین	فِیْمَا فِیْهِ :اس میں جس میں
یَخْتَلِفُوْنَ :یہ لوگ اختلاف کرتے ہیں	وَیَقُوْلُوْنَ :اور وہ کہتے ہیں
لَوْلَآ اُنْزِلَ :کیوں نہیں اُتاری گئی	عَلَیْهِ اٰیَةٌ :ان پر کوئی نشانی
مِّنْ رَّبِّهٖ :ان کے رب (کی طرف) سے	فَقُلْ اِنَّمَا :تو آپ کہیں کچھ نہیں سوائے اس کے کہ
اَلْغَیْبُ لِلّٰهِ :غیب تو اللہ کے لیے ہے	فَانْتَظِرُوْا :پس تم انتظار کرو
اِنِّیْ مَعَكُمْ :بے شک میں (بھی) تمہارے ساتھ	مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ :انتظار کرنے والوں میں سے ہوں

نوٹ ۱: آیت ۱۳ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم نے ''قُرُوْن'' کو ہلاک کیا۔ یہ قرن کی جمع ہے' جس کے معنی ہیں ''زمانہ''۔ پھر عام طور پر اس سے مراد ایک عہد کے لوگ ہوتے ہیں۔ لیکن قرآنِ مجید میں جس انداز سے مختلف مقامات پر اس لفظ کو استعمال کیا گیا ہے اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ''قرن'' سے مراد وہ قوم ہے جو اپنے دور میں عروج پر ہو اور کلی یا جزئی طور پر امامت پر سرفراز ہو۔ ایسی قوم کی ہلاکت لازماً یہی معنی نہیں رکھتی کہ اس کی نسل کو بالکل ختم ہی کر دیا جائے' بلکہ اس کا مقامِ عروج و امامت سے گرا دیا جانا' اس کے تہذیب و تمدن کا تباہ ہونا اور اس کے اجزاء کا پارہ پارہ ہو کر دوسری قوموں میں گم ہو جانا' یہ بھی ہلاکت ہی کی ایک صورت ہے۔ (تفہیم القرآن)

نوٹ ۲: آیت ۱۷ میں جن ظالموں کا ذکر ہے ان میں مسیلمہ کذّاب بھی شامل ہے۔ اسے جب ہلاک کیا گیا تو اس کی جماعت پراگندہ ہو گئی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس اس کے لوگ توبہ کرتے ہوئے آئے اور اسلام قبول کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان سے کہا کہ مسیلمہ کا کوئی قرآن تو سناؤ۔ انہوں نے معافی مانگی۔ ابوبکرؓ نے اصرار کیا کہ ضرور سنانا ہوگا تاکہ لوگ موازنہ کر کے ہدایت والی وحی کی فضیلت کو پہچان سکیں۔ انہوں نے جو کچھ سنایا اس کے چند نمونے درج ذیل ہیں:

(۱) یَا ضِفْدَعُ بِنْتَ ضِفْدَعَیْنِ نَقِّیْ کَمْ تَنْقَعِیْنَ لَا الْمَاءَ تَکْدَرِیْنَ وَلَا الشَّارِبَ تَمْنَعِیْنَ یعنی اے مینڈکی' اے مینڈکوں کی بیٹی! تو ٹراجتنا تو ٹراتی ہے' (اس سے) نہ تو پانی گدلا ہوگا اور نہ پینے والا باز رہے گا۔

(۲) وَالْعَاجِنَاتِ عَجْنًا وَالْخَابِزَاتِ خَبْزًا وَاللَّاقِمَاتِ لَقْمًا اِهَالَةً وَسَمْنًا اِنَّ قُرَيْشًا قَوْمٌ يَّعْتَدُوْنَ یعنی قسم ہے آٹا گوندھنے والیوں کی جیسا کہ گوندھتے ہیں اور روٹی پکانے والیوں کی جیسا کہ پکاتے ہیں اور لقمہ بنانے والیوں کی جیسا کہ لقمہ بناتے ہیں' چور چور کرتے ہوئے اور گھی ملاتے ہوئے' بے شک قریش ایک ایسی قوم ہے جو زیادتی کرتی ہے۔

(۳) اَلْفِيْلُ مَا الْفِيْلُ وَمَا اَدْرٰكَ مَاالْفِيْلُ لَهٗ ذَنْبٌ قَصِيْرٌ وَخُرْطُوْمٌ طَوِيْلٌ۔ یعنی ہاتھی' اور کیا ہاتھی' اور تجھ کو کیا خبر کہ ہاتھی کیا ہے؟ اس کی چھوٹی دم ہے اور لمبی سونڈ ہے۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اسلام لانے سے پہلے مسیلمہ کے دوست تھے۔ وہ اس سے ملنے گئے تو اس نے پوچھا: تمہارے آدمی یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر آج کل کیا وحی اُتری ہے؟ انہوں نے کہا: میں نے ان کے اصحاب کو ایک بڑی ہی زبردست سورت پڑھتے سنا ہے۔ اس نے پوچھا وہ کیا؟ تو انہوں نے سورۃ العصر پڑھ کر سنائی۔ اس پر اس نے کہا کہ مجھ پر بھی ایک ایسی ہی وحی اُتری ہے۔ انہوںؓ نے پوچھا وہ کیا؟ تو اس نے کہا: يَا وَبْرُ يَا وَبْرُ اِنَّمَا اَنْتَ اُذُنَانِ وَصَدْرُ وَسَائِرُكَ حَقَرٌ وَنَقَرٌ یعنی اے جانور' اے جانور! تو تو بس دو کان ہے اور سینہ ہے (یعنی تیرے دونوں کان اور سینہ نمایاں ہیں) اور تیرا باقی جسم حقیر اور ذلیل ہے۔ (ابن کثیر سے ماخوذ)

نوٹ ۳: آیت ۱۹ میں ہے کہ تمام لوگ ایک ہی اُمت تھے' شرک و کفر کا نام نہیں تھا' پھر توحید میں اختلاف کر کے مختلف قومیں بنیں۔ سب مسلمان ہونے کا زمانہ کتنا تھا اور کب تک رہا؟ روایاتِ حدیث و سیر سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے تک یہی صورت تھی۔ نوح علیہ السلام کے زمانے میں شرک و کفر ظاہر ہوا جس کا انہیں مقابلہ کرنا پڑا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت نوح علیہ السلام تک ایک طویل زمانہ ہے۔ دنیا میں انسانوں کی آبادی کافی پھیل چکی تھی۔ ان تمام انسانوں میں رنگ و روپ اور طرزِ معاشرت کا اختلاف ہونا بھی ایک طبعی امر ہے اور مختلف خطوں میں پھیل جانے کے بعد وطن کا اختلاف بھی یقینی ہے۔ لیکن قرآن نے اس نسبی' قبائلی اور وطنی اختلاف کو' جو امورِ فطریہ ہیں' وحدتِ اُمّت میں خلل انداز قرار نہیں دیا اور ان اختلاف کے باوجود اولادِ آدمؑ کو اُمّتِ واحدہ قرار دیا۔ ہاں جب ایمان کے خلاف کفر و شرک پھیلا تو کافر و مشرک کو الگ قوم اور الگ ملّت قرار دے کر فَاخْتَلَفُوْا ارشاد فرمایا۔ اس طرح واضح کر دیا کہ اولادِ آدمؑ کو مختلف قوموں میں بانٹنے والی چیز صرف ایمان و اسلام سے انحراف ہے۔ نسبی اور وطنی رشتوں سے قومیں الگ الگ نہیں ہوتیں۔ (معارف القرآن)

آیات ۲۱ تا ۳۰

﴿وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِيْٓ اٰيَاتِنَا ؕ قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا ؕ اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ ﴿۲۱﴾ هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ حَتّٰٓى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا

بِهَا جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۲۲﴾ فَلَمَّآ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ ۙ مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۳﴾ اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَ الْاَنْعَامُ ۗ حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ ۙ اَتٰىهَآ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ۗ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ۗ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۵﴾ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ۗ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ۗ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍ ۢ بِمِثْلِهَا ۙ وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۗ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا ۗ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷﴾ وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَشُرَكَآؤُكُمْ ۚ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۲۸﴾ فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ ﴿۲۹﴾ هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ وَرُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۳۰﴾

ع ص ف

عَصَفَ يَعْصِفُ (ض) عَصْفًا :(۱) جھونکا دینا' تیزی تیزی سے چلنا۔(۲) برباد کرنا' چورا چورا کر دینا۔﴿فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا ﴿۲﴾﴾ (المرسلت) ''پھر قسم ہے جھونکا دینے والیوں کی جیسا جھونکا دینے کا حق ہے۔''

عَصْفٌ (اسم ذات بھی ہے) : خشک پتّوں کا چورا' بھوسا۔﴿فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ﴿۵﴾﴾ (الفیل) ''پھر اس نے بنا دیا ان کو کھائے ہوئے بھوسے کی مانند۔''

عَاصِفٌ (فَاعِلٌ کے وزن پر صفت): جھونکا دینے والا یعنی (۱) تیز و تند (۲) آندھی۔زیر مطالعہ آیت ۲۲

م و ج

مَاجَ يَمُوْجُ (ن) مَوْجًا : سمندر کا جوش مارنا' لہروں کا ایک دوسرے پر چڑھنا' ریلا مارنا۔﴿وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ﴾ (الکہف:۹۹) ''اور ہم چھوڑیں گے ان کے بعض کو اس دن وہ ریلا

ماریں گے بعض میں۔‘‘

مَوْجٌ (اسم جنس) : واحد مَوْجَةٌ۔ جمع اور واحد دونوں کے لیے مَوْجٌ آتا ہے۔ لہر، موج۔ زیر مطالعہ آیت ۲۲

رھق

رَهِقَ يَرْهَقُ (س) رَهَقًا : زبردستی کسی پر حاوی ہو جانا۔ (۱) زبردستی کرنا۔ (۲) کسی پر چڑھائی کرنا‘ کسی کو ڈھانپ لینا‘ چھا جانا۔ زیر مطالعہ آیت ۲۶

رَهَقٌ (اسم ذات) : زبردستی‘ چودھراہٹ‘ داداگیری۔ ﴿فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ۝۶﴾ (الجن) ’’تو انہوں نے زیادہ کیا ان کو بلحاظ سرچڑھنے کے۔‘‘

اَرْهَقَ (افعال) اِرْهَاقًا : کسی کو کسی پر چڑھا دینا‘ ڈھانپ دینا‘ ڈال دینا۔ ﴿وَلَا تُرْهِقْنِيْ مِنْ اَمْرِيْ عُسْرًا ۝۷۳﴾ (الکہف) ’’اور آپ مت ڈالیں مجھ پر میرے کام کی وجہ سے‘ مشکل کو۔‘‘

ترکیب

(آیت ۲۱) بَعْدِ کا مضاف الیہ ضَرَّاءَ ہے اور نکرہ مخصوصہ۔ ضَرَّاءَ غیر منصرف ہے اس لیے نصب اور جر دونوں حالت میں ضَرَّاءَ آتا ہے۔ مَكْرًا تمیز ہے۔ (آیت ۲۲) جَاءَتْهَا سے پہلے وَاِذَا محذوف ہے اور هَا کی ضمیر اَلْفُلْكِ کے لیے ہے۔ (آیت ۲۳) مَتَاعَ کی نصب بتا رہی ہے کہ اس سے پہلے فعل محذوف ہے جو فَتَمَتَّعُوْا ہو سکتا ہے۔ (آیت ۲۴) لَيْلًا اور نَهَارًا ظرفِ زمان ہیں۔ تَغْنَ دراصل مؤنث کا صیغہ تَغْنٰی ہے‘ لَمْ کی وجہ سے یا گری ہوئی ہے۔ (آیت ۲۷) اُغْشِيَتْ کا نائب فاعل وُجُوْهُهُمْ ہے اور قِطَعًا اس کا مفعول ثانی ہے‘ جبکہ مُظْلِمًا حال ہے۔ (آیت ۲۸) مَكَانَكُمْ مفعول ہے اور اس کا فعل محذوف ہے۔ (آیت ۲۹) اِنْ كُنَّا میں اِنْ مخففہ ہے جس کے معنی ہیں: یقیناً۔ (آیت ۳۰) اللّٰهِ کا بدل ہونے کی وجہ سے مَوْلٰىهُمْ میں مَوْلٰى محلاً حالتِ جر میں ہے اس لیے اس کی صفت اَلْحَقِّ حالتِ جر میں آئی ہے۔

ترجمہ:

وَاِذَآ : اور جب

رَحْمَةً : کچھ رحمت

مَسَّتْهُمْ : چھوا ان کو

مَّكْرٌ : کوئی تدبیر (یعنی حیلہ بہانہ) ہے

قُلِ اللّٰهُ : آپؐ کہیے اللہ

اِنَّ رُسُلَنَا : یقیناً ہمارے رسول (یعنی فرشتے)

اَذَقْنَا النَّاسَ : ہم چکھاتے ہیں لوگوں کو

مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ : اس تکلیف کے بعد جس نے

اِذَا لَهُمْ : جب ہی ان کے لیے

فِيْٓ اٰيَاتِنَا : ہماری نشانیوں میں

اَسْرَعُ مَكْرًا : سب سے تیز ہے بلحاظ تدبیر کرنے کے

يَكْتُبُوْنَ : لکھتے ہیں

مَا تَمْكُرُوْنَ :اس کو جو تم لوگ بہانے بناتے ہو

يُسَيِّرُكُمْ :گھماتا پھراتا ہے تم لوگوں کو

وَالْبَحْرِ :اور سمندر میں

اِذَا كُنْتُمْ :جب تم لوگ ہوتے ہو

وَجَرَيْنَ بِهِمْ :اور وہ بہتی ہیں ان کے ساتھ

وَّفَرِحُوْا بِهَا :اس حال میں کہ وہ خوش ہوتے ہیں اس سے

رِيْحٌ عَاصِفٌ :ایک تیز و تند ہوا

الْمَوْجُ :موج

وَّظَنُّوْٓا :اور انہوں نے سمجھ لیا

اُحِيْطَ بِهِمْ :احاطہ کیا گیا جن کا

مُخْلِصِيْنَ :خالص کرنے والے ہوتے ہوئے

لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا :یقیناً اگر تو نے نجات دی ہم کو

لَنَكُوْنَنَّ :تو ہم لازماً ہوں گے

فَلَمَّآ اَنْجٰىهُمْ :پھر جب ہم نجات دیتے ہیں ان کو

يَبْغُوْنَ :سرکشی کرتے ہیں

بِغَيْرِ الْحَقِّ :حق کے بغیر

اِنَّمَا بَغْيُكُمْ :کچھ نہیں سوائے اس کے کہ تمہاری سرکشی

مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا :(تو فائدہ اٹھالو) دنیوی زندگی کے سامان سے

مَرْجِعُكُمْ :تمہارا لوٹنا ہے

بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ :وہ جو تم کیا کرتے تھے

مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا :دنیوی زندگی کی مثال

اَنْزَلْنٰهُ :ہم نے اتارا جس کو

فَاخْتَلَطَ بِهٖ :تو رل مل گیا اس کے ذریعہ سے

هُوَ الَّذِيْ :وہی ہے جو

فِي الْبَرِّ :خشکی میں

حَتّٰٓى :یہاں تک کہ

فِي الْفُلْكِ :کشتی میں

بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ :ایک سازگار ہوا کے ذریعہ سے

جَآءَتْهَا :(اور جب) آتی ہے اس (کشتی) کے پاس

وَّجَآءَهُمُ :اور آتی ہے ان لوگوں کے پاس

مِنْ كُلِّ مَكَانٍ :ہر جگہ سے

اَنَّهُمْ :کہ وہ لوگ ہیں

دَعَوُا اللّٰهَ :تو انہوں نے پکارا اللہ کو

لَهُ الدِّيْنَ :اس کے لیے دین کو

مِنْ هٰذِهٖ :اس سے

مِنَ الشّٰكِرِيْنَ :شکر کرنے والوں میں سے

اِذَا هُمْ :جب ہی وہ لوگ

فِي الْاَرْضِ :زمین میں

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ :اے لوگو

عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ :تمہاری اپنی جانوں پر ہے

ثُمَّ اِلَيْنَا :پھر ہماری طرف ہی

فَنُنَبِّئُكُمْ :تو ہم بتادیں گے تم کو

اِنَّمَا :کچھ نہیں سوائے اس کے کہ

كَمَآءٍ :ایسے پانی جیسی ہے

مِنَ السَّمَآءِ :آسمان سے

نَبَاتُ الْاَرْضِ :زمین کا سبزہ

مِمَّا يَأْكُلُ : جس میں سے کھاتے ہیں
وَالْاَنْعَامُ : اور چوپائے
اَخَذَتِ الْاَرْضُ : پکڑا زمین نے
وَازَّيَّنَتْ : اور وہ سج گئی
اَنَّهُمْ : کہ وہ
عَلَيْهَآ : اس پر
اَمْرُنَا : ہمارا حکم
اَوْ نَهَارًا : یا دن کے وقت
حَصِيْدًا : کٹی ہوئی کھیتی
بِالْاَمْسِ : کل کو
نُفَصِّلُ : ہم کھول کھول کر بیان کرتے ہیں
لِقَوْمٍ : ایسے لوگوں کے لیے جو
وَاللّٰهُ : اور اللہ
اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ : سلامتی کے گھر کی طرف
مَنْ يَّشَآءُ : اس کو جس کو وہ چاہتا ہے

لِلَّذِيْنَ : ان لوگوں کے لیے جنہوں نے
الْحُسْنٰى : سب سے خوبصورت (اجر) ہے
وَلَا يَرْهَقُ : اور نہیں چھائے گی
قَتَرٌ : کوئی سیاہی
اُولٰٓئِكَ : یہ لوگ
هُمْ فِيْهَا : وہ لوگ اس میں
وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا : اور جنہوں نے کمائیں
جَزَآءُ سَيِّئَةٍ : (تو) کسی برائی کا بدلہ
وَتَرْهَقُهُمْ : اور چھائے گی ان پر
مَا لَهُمْ : نہیں ہے ان کے لیے
مِنْ عَاصِمٍ : کوئی بھی بچانے والا

النَّاسُ : لوگ
حَتّٰٓى اِذَآ : یہاں تک کہ جب
زُخْرُفَهَا : اپنے سنگھار کو
وَظَنَّ اَهْلُهَآ : اور خیال کیا اس کے لوگوں نے
قٰدِرُوْنَ : قدرت رکھنے والے ہیں
اَتٰىهَآ : (تو) آیا اس کے پاس
لَيْلًا : رات کے وقت
فَجَعَلْنٰهَا : پھر بنا دیا ہم نے اس کو
كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ : جیسے کہ وہ تھی ہی نہیں
كَذٰلِكَ : اس طرح
الْاٰيٰتِ : نشانیوں کو
يَتَفَكَّرُوْنَ : غور وفکر کرتے ہیں
يَدْعُوْٓا : بلاتا ہے
وَيَهْدِيْ : اور وہ ہدایت دیتا ہے
اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ : ایک سیدھے راستے کی طرف

اَحْسَنُوا : بلاکم وکاست کام کیا
وَزِيَادَةٌ : اور زیادہ (بھی) ہے
وُجُوْهَهُمْ : ان کے چہروں پر
وَّلَا ذِلَّةٌ : اور نہ ہی کوئی ذلت
اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ : جنت والے ہیں
خٰلِدُوْنَ : ہمیشہ رہنے والے ہیں
السَّيِّاٰتِ : برائیاں
بِمِثْلِهَا : اسی کے جیسا ہے
ذِلَّةٌ : ایک ذلت
مِّنَ اللّٰهِ : اللہ سے
كَاَنَّمَآ : جیسے کہ بس

اُغْشِيَتْ : ڈھانپ دیے گئے	وُجُوْهُهُمْ : ان کے چہرے
قِطَعًا : ایک ٹکڑے سے	مِّنَ الَّيْلِ : رات میں سے
مُظْلِمًا : اندھیری ہوتے ہوتے	اُولٰٓئِكَ : یہ لوگ
اَصْحٰبُ النَّارِ : آگ والے ہیں	هُمْ فِيْهَا : وہ اس میں
خٰلِدُوْنَ : ہمیشہ رہنے والے ہیں	وَيَوْمَ : اور جس دن
نَحْشُرُهُمْ : ہم اکٹھا کریں گے ان کو	جَمِيْعًا : سب کے سب کو
ثُمَّ نَقُوْلُ : پھر ہم کہیں گے	لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا : ان سے جنہوں نے شرک کیا
مَكَانَكُمْ : (تم لوگ کھڑے رہو) اپنی جگہ پر	اَنْتُمْ : تم بھی
وَشُرَكَآؤُكُمْ : اور تمہارے شریک بھی	فَزَيَّلْنَا : پھر ہم الگ الگ کریں گے
بَيْنَهُمْ : (ان کو) ان کے مابین سے	وَقَالَ شُرَكَآؤُهُمْ : اور کہیں گے ان کے شریک لوگ
مَّا كُنْتُمْ : نہیں تھے تم کہ	اِيَّانَا : صرف ہماری ہی
تَعْبُدُوْنَ : بندگی کرتے تھے	فَكَفٰى بِاللّٰهِ : تو کافی ہے اللہ
شَهِيْدًا : بطور گواہ کے	بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ : ہمارے درمیان اور تمہارے درمیان
اِنْ كُنَّا : یقیناً ہم تھے	عَنْ عِبَادَتِكُمْ : تمہاری عبادت سے
لَغٰفِلِيْنَ : بالکل غافل	هُنَالِكَ تَبْلُوْا : وہاں جانچ لے گی
كُلُّ نَفْسٍ : ہر جان	مَّآ اَسْلَفَتْ : اس کو جو اس نے آگے بھیجا
وَرُدُّوْٓا : اور وہ لوٹائے جائیں گے	اِلَى اللّٰهِ : اللہ کی طرف
مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ : جو ان کا حقیقی آقا ہے	وَضَلَّ عَنْهُمْ : اور گم ہو جائے گا ان سے
مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ : جو وہ گھڑتے تھے	

❁❁❁

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر
''بیان القرآن'' کے ترجمہ و ترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں'
آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

اقوالِ امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ

محمد رشید ارشد☆

بسم الله والحمد لله ، والصلاة والسلام علی محمد رسول الله ، وعلی آله وصحبه ومن والاه

آج کی گفتگو میں ہم‘ ان شاء اللہ‘ سیّدنا حسن بصریؒ کے اقوال اختصار کے ساتھ پڑھیں گے‘ لیکن اوّلاً ان کا مختصر سا تعارف پیشِ خدمت ہے: آپ کا نام حسن اور کنیت ابوسعید ہے‘ تابعی ہیں‘ مقامِ پیدائش مدینہ‘ طویل عمر پائی اور ۱۱۰ ہجری میں بصرہ میں انتقال ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں وعظ اور بیان کی غیر معمولی صلاحیت دی تھی۔

روایت ہے کہ ایک مرتبہ حسن بصریؒ وعظ کہہ رہے تھے‘ اُمّ المومنین سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کی گفتگو سن لی تو انہوں نے استفسار فرمایا کہ: من هذا الذی یتکلم بكلام الصِدِّیقین۔ ’’یہ کون صاحب ہیں جو ایسا کلام کر رہے ہیں جیسے صدیقین کلام کیا کرتے ہیں؟‘‘۔ سیّدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ابو بردہؓ ان کے بارے میں اپنا یہ تاثر بیان کرتے ہیں کہ: ما رأیتُ أحدا أشبه بأصحاب رسول الله ﷺ منه۔ ’’میں نے کبھی کسی شخص کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہؓ سے ان سے زیادہ مشابہ نہیں دیکھا‘‘۔ ابو بردہؓ خود بھی تابعی ہیں اور فرما رہے ہیں کہ صمت‘ کلام اور اخلاق کے معاملے میں کوئی بھی تابعی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اتنی مشابہت نہیں رکھتا جتنی سیّدنا حسن بصریؒ رکھتے ہیں۔

امام غزالیؒ ان کے بارے میں اپنا تاثر ارشاد فرماتے ہیں کہ: أشبه الناس كلاماً بكلام الأنبیاء۔ ’’انسانوں میں انبیاء کرام علیہم السلام کے کلام سے سب سے زیادہ مشابہ کلام حسن بصری کا ہے‘‘۔ یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد ان کا کلام انبیاء کے سب سے زیادہ مشابہ ہے کیونکہ بلاشبہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے فضائل عام انسانوں سے بہت زیادہ ہیں۔

ایک بار سیّدنا علیؒ بن حسینؓ کے سامنے حسن بصریؒ کا یہ قول نقل کیا گیا: لیس العجب لمن هلك كیف هلك‘ إنما العجب لمن نجا كیف نجا۔ ’’یعنی جو شخص ہلاک ہوا اس پر کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ کیسے ہلاک ہوگیا‘ لیکن جس نے نجات پالی اس پر تعجب ہے کہ وہ کیسے نجات پا گیا‘‘۔ جب سیّدنا علی بن حسین نے یہ سنا تو فرمایا: سبحان الله! هذا كلام صدیق۔ ’’سبحان اللہ! یہ کسی صدیق کا کلام ہے‘ عام آدمی کا کلام نہیں‘‘۔

اگر ہم اپنے دین میں تزکیہ واحسان کی روایت کا مطالعہ کریں‘ جس کا دوسرا عنوان تصوّف ہے‘ تو یہ بات آشکارا ہو جاتی ہے کہ تزکیہ واحسان انسانی شخصیت کے ایک اہم پہلو سے متعلق ہے۔ کیونکہ ’’حدیث احسان‘‘ جس کو حدیثِ جبرائیل بھی کہا جاتا ہے‘ اس میں تین بڑے سوالات کیے گئے ہیں: اسلام کیا ہے‘ ایمان کیا ہے اور احسان کیا ہے؟ اسلام کی تفصیلات میں اعمال شمار کیے گئے ہیں جن کا تعلق انسانی صلاحیتوں میں سے ارادے کے ساتھ ہے۔ اس کا ذمہ ہمارے ہاں فقہائے کرام نے لے لیا۔ اور ایمان کے ذیل میں یقین کا بیان ہے‘ جس کا تعلق انسانی ذہن

☆ لیکچرر‘ شعبہ فلسفہ‘ جامعہ پنجاب‘ لاہور

اور فکر سے ہے۔ اس کے لیے ہمارے ہاں علم العقیدہ اور علم الکلام وجود میں آیا' اور احسان کے ذیل میں جو فرمایا گیا اس کا تعلق انسانی صلاحیتوں میں سے طبیعت اور مزاج سے ہے' اس کا بیڑا ہمارے صوفیائے کرام نے اٹھایا ہے۔ الغرض یہ تین شعبے ایسے ہیں جو دنیا کے ہر مذہب میں پائے جاتے ہیں: کلام' فقہ اور تصوّف۔

پھر تزکیہ و احسان کی روایت میں بھی اللہ تعالیٰ سے تعلق کی تین بڑی بنیادیں ہیں: خشیت' معرفت اور محبّت۔ ارادے اور عمل کی جہت سے تعلق مع اللہ زیادہ تر خشیت کی بنیاد پر ہوتا ہے' اور ذہنی فکر اور سوچ کی جہت سے جب اللہ اور بندے کے درمیان تعلق قائم ہوتا ہے تو اس کا عنوان معرفت ہوتا ہے۔ اور جب انسان طبیعت اور مزاج کی جہت سے اللہ تعالیٰ سے متعلق ہوتا ہے تو اس کا عنوان محبّت قرار پاتا ہے۔

تزکیہ و احسان کی روایت مختلف مراحل سے گزرتی ہوئی ہم تک پہنچی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ تصوّف کا عنوان پہلے دن ہی سے اس پر چسپاں کر دیا گیا تھا' بلکہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک مسمّٰی پہلے سے موجود ہوتا ہے جب کہ اس کا عنوان بعد میں اس کے لیے تجویز کیا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ ضروری نہیں کہ ابتدا میں اس شعبے سے وابستہ افراد خود بھی اپنے صوفی ہونے کا استحضار رکھتے ہوں یا لوگ ان پر صوفی کی اصطلاح چسپاں کرتے ہوں' بلکہ تاریخ کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدائی دور میں تصوّف بہت محدود صورت میں موجود تھا' اور اس سے وابستہ افراد کو بُکّاؤون' عُبّاد اور زُھّاد کا عنوان دیا جاتا تھا۔ یعنی اللہ کے خوف میں بہت زیادہ رونے والے' بہت زیادہ عبادت کرنے والے اور دنیا سے بے رغبتی رکھنے والے لوگ۔

ابتدائی مرحلے میں تصوّف کے شعبے میں خشیت و خوف کا غلبہ تھا۔ پھر رفتہ رفتہ اس میں معرفت کا پہلو غالب آ گیا' اور اللہ تعالیٰ سے ذہنی و فکری تعلق کو بھی بہت زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا۔ تیسری یا چوتھی صدی ہجری میں تصوّف کے موضوع پر کئی ایسی کتب لکھی گئیں جو تصوّف کی اُمہات الکتب کہلاتی ہیں' مثلاً: امام ابوالقاسم قشیریؒ کا ''رسالہ قشیریہ''، امام حارث محاسبیؒ کی کتاب ''رسالۃ المسترشدین''، ابوطالب مکی کی کتاب ''قُوت القلوب'' اور اسی طرح ابوبکر کلاباذیؒ کی کتاب ''التعرف لمذھب أھل التصوّف'' ہے۔ اگر ان کتب کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں ایک حصہ خشیت' توبہ و رجوع اور محبّت کے مضامین پر مشتمل ہے' لیکن ایک حصے میں معارف پر مشتمل مضامین بھی ملتے ہیں' یعنی اللہ تعالیٰ سے تعلق کی عرفانی جہت کا بیان بھی ملتا ہے۔ یہ تصوّف کا دوسرا مرحلہ تھا۔ اور تیسرے مرحلے میں تصوّف پر طبیعت کا غلبہ زیادہ ہوا' اور اللہ تعالیٰ سے محبّت کی بنیاد پر تعلق کو بہت زیادہ اجاگر کیا گیا۔ یہ تیسرا دور تھا۔ اور اب تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ دور بھی گزر چکا ہے' اور (معاذ اللہ!) شاید اللہ سے ناز و نخرے والا دور چل رہا ہے' کیونکہ بارہا دیکھا جاتا ہے محض محبّت کی آڑ میں اہم ترین فرائض و عبادات میں اللہ تعالیٰ سے بہت زیادہ چھوٹ بھی حاصل کر لی جاتی ہے۔ لیکن ان تینوں میں اگر غور کیا جائے تو محفوظ ترین طریقہ یہ ہے کہ تعلق مع اللہ' خشیت کی بنیاد پر ہو' اور یہی درحقیقت علم کا سب سے بڑا اثر ہے: ﴿اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ (فاطر: ۲۸) ''اللہ سے اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو علم رکھنے والے ہیں''۔ خشیت کی بنیاد پر جو بات کی جاتی ہے وہ بہت محتاط انداز میں کی جاتی ہے' اس میں ڈینگیں اور دعوے موجود نہیں ہوتے۔

اس لحاظ سے بھی ہمارے لیے حسن بصریؒ کی شخصیت بہت اہم ہے' کیونکہ حسن بصریؒ دائم الاحزان تھے'

چنانچہ آپ خوفِ خدا کی بنا پر اکثر روتے رہتے تھے۔ ان کے مواعظ پر مشتمل کلام مختلف ٹکڑوں میں منقول ہے' امام ابن جوزیؒ (جو متعدد کتب کے مصنف ہیں) کی ایک کتاب اس موضوع پر بھی ہے: آداب الحسن البصری وزھدہ ومواعظہ یعنی حسن بصریؒ نے جو آداب بیان کیے ہیں ان کا بیان اور ان کے زہد اور مواعظ کا بیان۔ ان کے مواعظ مختلف کتابوں میں جمع کیے گئے ہیں' امام ابن جوزیؒ کے رسالے سے میں نے حسن بصریؒ کے کچھ اقوال جمع کیے ہیں' افادے کی غرض سے انہیں یہاں درج کیا جائے گا۔

ان اقوال کے مطالعے سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لیجیے کہ یہ اقوال ایسے نہیں ہیں کہ انہیں سمجھنے کے لیے ہمیں زیادہ تشریح کی ضرورت پیش آئے' لہٰذا مقصود ان اقوال کا سمجھنا سمجھانا نہیں ہے' بلکہ مقصود یہ ہے کہ ہم ان اقوال کی تاثیر اپنے دل میں جاگزیں کریں۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم نے اپنی توجّہ کا ارتکاز فہم پر زیادہ کر دیا ہے' جبکہ ہمارے دل کسی چیز کی اثر پذیری سے محروم ہو چکے ہیں' حالانکہ کسی بھی اچھائی کے معاملے میں فہم سے زیادہ اہم اس کی تاثیر کو قبول کرنا ہے۔ قرآن مجید بھی ہم سے فہم وتدبر کے ساتھ ساتھ تاثیر کا مطالبہ بھی کرتا ہے کہ قرآن مجید کا اثر دلوں پر نقش ہونا چاہیے۔ مطلوب یہ ہونا چاہیے کہ قرآن ہمارے اندر ایک سوز پیدا کرے' اور اندر کی دنیا کو تبدیل کرے۔

اسی لیے خود قرآن مجید میں مؤمنین پر آیاتِ قرآنیہ کا اثر خوف وخشیت اور تضرع کی صورت میں ذکر کیا گیا ہے۔ سورۃ الزمر میں فرمایا: ﴿اَللّٰہُ نَزَّلَ اَحۡسَنَ الۡحَدِیۡثِ کِتٰبًا مُّتَشَابِہًا مَّثَانِیَ ٭ۖ تَقۡشَعِرُّ مِنۡہُ جُلُوۡدُ الَّذِیۡنَ یَخۡشَوۡنَ رَبَّہُمۡ ۚ ثُمَّ تَلِیۡنُ جُلُوۡدُہُمۡ وَ قُلُوۡبُہُمۡ اِلٰی ذِکۡرِ اللّٰہِ ؕ﴾ (آیت ۲۳) ''اللہ نے بہترین کلام نازل فرمایا ہے' ایک ایسی کتاب جس کے مضامین ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں' جس کی باتیں بار بار دہرائی گئی ہیں۔ وہ لوگ جن کے دلوں میں اپنے پروردگار کا رعب ہے ان کی کھالیں اس سے کانپ اٹھتی ہیں' پھر ان کے جسم اور ان کے دل نرم ہو کر اللہ کی یاد کی طرف متوجّہ ہو جاتے ہیں''۔ اسی طرح سورۃ الانفال میں ہے: ﴿اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِیۡنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتۡ قُلُوۡبُہُمۡ وَ اِذَا تُلِیَتۡ عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتُہٗ زَادَتۡہُمۡ اِیۡمَانًا وَّ عَلٰی رَبِّہِمۡ یَتَوَکَّلُوۡنَ ۚ﴿۲﴾﴾ ''مؤمن تو وہ لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر ہوتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں' اور جب ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ آیتیں ان کے ایمان کو اور ترقّی دیتی ہیں' اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ کرتے ہیں''۔ ان آیات میں یہ بات واضح ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت کی تاثیر اچھل کود' شور شرابا یا نعرے بازی نہیں ہے' بلکہ تضرع وزاری' انابت اور خوف ہے۔ اس لیے ہم امام حسن بصریؒ کے اقوال کو بھی اسی نیت سے پڑھیں گے کہ انہیں سن کر ان کا اثر اپنے دل پر نقش کریں' اور ان کے مطابق عمل پیرا ہوں۔

اقوالِ امام حسن بصریؒ

✿ عملوا للّٰہ بالطاعات ' واجتھدوا فیھا ' وخافوا أن تردّ علیھم۔ حسن بصریؒ اللہ کے نیک بندوں کے بارے میں کہتے ہیں: ''یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر عامل رہتے ہیں اور اس معاملے میں خوب محنت کرتے ہیں' لیکن یہ سب کرنے کے باوجود ان کو اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں یہ چیزیں بارگاہ خداوندی میں رد نہ کر دی جائیں' قبول نہ کی جائیں''۔ یعنی کوئی ناز یا ادّعا پیدا نہیں ہوتا۔

سورۃ المومنون میں ارشاد ہے: ﴿وَ الَّذِیۡنَ یُؤۡتُوۡنَ مَا اٰتَوۡا وَّ قُلُوۡبُہُمۡ وَجِلَۃٌ اَنَّہُمۡ اِلٰی رَبِّہِمۡ رٰجِعُوۡنَ ﴿۶۰﴾﴾ ’’اور وہ جو عمل بھی کرتے ہیں‘ اسے کرتے وقت ان کے دل اس بات سے سہمے ہوتے ہیں کہ انہیں اپنے پروردگار کے پاس واپس جانا ہے‘‘۔ سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ اے اللہ کے نبی! یہ کن لوگوں کا تذکرہ ہو رہا ہے‘ کیا یہ وہ لوگ ہیں جو شراب پیتے ہیں اور چوری کرتے ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: ((لا یا بِنْتَ الصِّدِّیق‘ ولکنھم الذین یصومون ویصلّون ویتصدّقون‘ وھم یخافون أن لا یقبل منھم)) (سنن الترمذی‘ ح:۳۲۲۵) ’’اے صِدّیق کی بیٹی! ایسا نہیں ہے‘ بلکہ یہ ان لوگوں کا تذکرہ ہو رہا ہے جو روزہ رکھتے ہیں‘ نماز پڑھتے ہیں اور صدقہ دیتے ہیں‘ لیکن انہیں یہ اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ سب ان سے قبول نہ کیا جائے۔‘‘

اسی کی وضاحت میں امام صاحب فرما رہے ہیں کہ: إنّ المؤمن جمع إحسانًا وخشیةً ‘ والمنافق جمع إساءةً و أمنًا۔ ’’مؤمن احسان اور خشیت کو جمع کرتا ہے جب کہ منافق برائیوں اور امن کو جمع کرتا ہے‘‘۔ احسان کا مطلب ہے اچھے اعمال‘ خوب کاری اور خوب صورت اعمال‘ یعنی وہ نیک اعمال کی ادائی اچھے طریقے سے کرتا ہے اور ڈرتا بھی رہتا ہے کہ معلوم نہیں میرا یہ عمل درجۂ قبولیت کے معیار پر پہنچا بھی یا نہیں‘ میری نیت بھی صاف تھی یا نہیں‘ اللہ کے ہاں شرف قبولیت پا سکے گا یا نہیں۔ جبکہ منافق برائیوں اور امن کو جمع کرتا ہے‘ یعنی برے اعمال بھی کرتا ہے اور بے خوف بھی رہتا ہے‘ اسے کوئی پریشانی ہی لاحق نہیں ہوتی۔ نفاق کے بارے میں آپ کا ایک مشہور قول ہے: ما أمنه إلا منافق‘ وما خاف منه إلّا مؤمن۔ ’’نفاق سے اپنے آپ کو مامون نہیں سمجھتا مگر وہی جو منافق ہو‘ اور اس کا خوف و اندیشہ نہیں کرتا مگر وہی جو مومن ہو‘‘۔ اس لیے مؤمن نیک عمل کرتا ہے مگر اس پر ناز نہیں کرتا‘ بلکہ ڈرتا رہتا ہے‘ اور منافق برے اعمال بھی کرتا ہے اور بے خوف بھی رہتا ہے۔

۞ حقیقة حسن الخلق: بذل المعروف ‘ وکفّ الأذی ‘ وطلاقة الوجه۔ ’’حُسنِ خلق کی حقیقت بھلائیاں کرنا اور اپنے آپ کو دوسروں کی تکلیف سے روکے رکھنا اور بشاشت کے ساتھ رہنا ہے‘‘۔ بھلائیاں کرنا خواہ کسی بھی صورت میں ہو‘ چاہے اس کا تعلق مال سے ہو یا عمل سے ہو۔ اور خود کو دوسروں کی تکلیف سے روکے رکھنا کم سے کم درجہ ہے۔ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صدقہ کی بہت زیادہ ضرورت و اہمیت بتلائی تو ایک صاحبؓ نے کہا کہ میں تو کسی بھی لائق نہیں ہوں‘ کسی کو مال بھی دینے کے قابل نہیں‘ لہٰذا ایسا آدمی جو کوئی نیکی کا کام بھی نہ کر سکے‘ اور نہ کسی کو بھلائی کی دعوت دے سکے‘ اور نہ ہی کسی کو برائی سے روک سکے تو وہ کیا کرے؟ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آخری درجے کے طور پر فرمایا کہ پھر لوگوں کو تکلیف دینے سے بچے رہو‘ لوگوں کو اذیت مت دو۔

فرمایا کہ یہ بھی حسن خلق میں شامل ہے کہ انسان کسی کو اذیت دینے سے رکا رہے‘ اور بشاشت و مسکراہٹ کے ساتھ رہے‘ خوش و خرم رہے۔ جب کہ عمومی مشاہدہ یہ ہے کہ جو لوگ کچھ دین دار ہوتے ہیں ان کے اندر ایک یبوست اور سختی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے‘ بلکہ خوش و خرم رہنا چاہیے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک مرتبہ صبح صبح بیدار ہوئے تو بہت طیب النفس‘ خوش و خرم تھے‘ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس آدمی کے پاس تقویٰ ہو اور مال بھی ہو تو یہ بہت فضیلت کی بات ہے‘ لیکن طیب النفس ہونا بھی اللہ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ لہٰذا انسان ہشاش بشاش و

خوش وخرم رہے۔خوش ہونے کے ایک معنیٰ یہ ہیں کہ غفلت اور لاابالی پن کی بنا پر ہمیشہ مستی میں رہے۔ادھر یہ مراد نہیں' بلکہ مطلوب یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا استحضار رکھتے ہوئے ان پر خوشی محسوس کرے۔جیسا کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: ((تَبَسُّمُكَ فِي وَجْهِ أَخِيكَ لَكَ صَدَقَةٌ)) (سنن الترمذی' أبواب البر والصلة' باب ماجاء في صنائع المعروف) ''تمہارا اپنے بھائی کے سامنے مسکرا کر ملنا اور مواجہہ کرنا بھی ایک صدقہ ہے۔''

۞ إنّ بين العبد وبين الله عز وجلّ حدّا محدودًا من الذُّنوب' فإذا بلغه العبد طبع على قلبه' فلم يوفّقه للخير أبدًا۔ ''اللہ اور بندے کے درمیان گناہوں کے حوالے سے ایک حد متعین ہے' جب بندہ کثرتِ گناہ کی بنا پر اس حد کو پہنچ جاتا ہے تو اس کے دل پر مہر لگا دی جاتی ہے اور پھر اسے کبھی بھی خیر کی توفیق نہیں ہوتی۔''

اس معاملے میں اصول تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اختیار کے قانون پر پیدا فرمایا ہے۔اسے نیکی اور بدی دونوں کے راستے بتا دیے کہ جس پہ چاہے چلے' جیسے فرمایا: ﴿اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝۳﴾ (الدھر) ''ہم نے اسے راستہ دکھایا کہ وہ یا تو شکر گزار ہو' یا ناشکرا بن جائے''۔اللہ نے انسان کو اختیار تو دیا لیکن مطالبہ یہ کیا کہ بندے اپنے اس اختیار کو استعمال کرتے ہوئے شکر گزاری اور عبادت کا رویہ اختیار کریں۔

سمجھنے کی بات یہ ہے کہ نیکی اور بدی' شکر اور ناشکری کے درمیان' انسان کو دیا گیا یہ اختیار بالکل آزادانہ نہیں' بلکہ اس کا یہ اختیار اللہ تعالیٰ کے اختیار اور مرضی کے ماتحت ہے۔اب اگر انسان اپنے اس اختیار کا غلط استعمال کرے اور نیکی اور ہدایت کے راستے کو اختیار نہ کرے تو ایک وقت ایسا آتا ہے اللہ تعالیٰ اپنا عطا کردہ وہ اختیار سلب کر لیتے ہیں۔حسن بصریؒ کے قول میں اس اختیار کے ختم ہونے کا بیان ہے۔قرآن مجید میں اس قبیل کی آیات: ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ (البقرۃ:۷) ''اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے'' یا ﴿طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۹۳﴾ (التوبۃ) ''اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے' اس لیے انہیں حقیقت کا پتا نہیں چلتا'' کی حقیقت بھی یہی ہے کہ ایک خاص موقعے تک اختیار کا قانون چلتا ہے' اور جب بندہ مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرتا ہے تو اس پر جبر طاری ہو جاتا ہے۔وہ جبر کیا ہے؟ دل پر اللہ کی طرف سے مہر لگا دی جاتی ہے! اس چیز کا بیان قرآن مجید میں بھی ہے: ﴿وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَ اَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝۱۱۰﴾ (الانعام) ''جس طرح یہ لوگ پہلی بار (قرآن جیسے معجزے پر) ایمان نہیں لائے' ہم بھی (ان کی ضد کی پاداش میں) ان کے دلوں اور نگاہوں کا رخ پھیر دیتے ہیں' اور ان کو اس حالت میں چھوڑ دیتے ہیں کہ یہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے پھریں''۔بار بار انہیں حق کی طرف بلایا گیا' حتیٰ کہ ایک وقت وہ آیا کہ اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی۔

دلوں پر مہر لگایا جانا ایک سزا ہے۔سرکشی اور انکار پر سزا آخرت میں ملتی ہے' لیکن کچھ لوگوں کو دنیا میں بھی سزا مل جاتی ہے کہ ان سے نیکی یا ہدایت کا اختیار سلب کر لیا جاتا ہے اور دل پر مہر لگا دی جاتی ہے۔ایک مشہور روایت بھی ہے کہ جب بندہ گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے' جب توبہ کر لیتا ہے تو وہ نقطہ دھل جاتا ہے' لیکن اگر وہ گناہ کرتا رہتا ہے تو ان سیاہ نقطوں کی وجہ سے اس کا قلب سیاہ ہو جاتا ہے اور پھر اس پر مہر کر دی جاتی ہے۔اللہ تعالیٰ

ہم سب کو اس انجام سے بچائے۔ آمین!

۞ وَاللّٰہِ ما دون القرآن من غنًی ولا بعدہ من فاقۃ۔ ’’اللہ گواہ ہے کہ قرآن کے بغیر کوئی تونگری اور غنا نہیں ہے‘ اور قرآن حاصل ہونے کے بعد کوئی محرومی نہیں ہے‘‘۔ اصل تونگری تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو قرآن کی دولت عطا کر دے۔ ایک مشہور روایت ہے: ((لَیْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ یَتَغَنَّ بِالْقُرْآنِ)) (صحیح البخاری‘ کتاب التوحید) ہم نے جب یہ حدیث پڑھی تھی تو اس لفظ پر بھی بحث ہوئی تھی کہ عام طور پر یہ روایت تجوید یا قرآن مجید کو خوش اِلحانی سے پڑھنے کے لیے بیان کی جاتی ہے کہ قرآن کو سجا بنا کر پڑھا جائے‘ لیکن زیادہ راجح قول کے مطابق اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص قرآن کی نعمت سے نوازے جانے کے باوجود خود کو غنی نہ سمجھے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

اور شارحین نے اس حدیث پر کلام کرتے ہوئے لکھا ہے کہ خوش اِلحانی تو ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے‘ ایک شخص اگر قرآن کو اچھی آواز میں بنا سنوار کر پڑھ سکتا ہے تو دوسرا شخص اس پر قادر نہیں ہوتا۔ جب کہ روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں: ((اَلْمَاهِرُ بِالْقُرْآنِ مَعَ السَّفَرَةِ الْكِرَامِ الْبَرَرَةِ‘ وَالَّذِي يَقْرَأُ الْقُرْآنَ وَيَتَتَعْتَعُ فِيهِ ‘ وَهُوَ عَلَيْهِ شَاقٌّ‘ لَهُ أَجْرَانِ)) (صحیح مسلم‘ کتاب صلاۃ المسافرین وقصرھا‘ باب فضل الماھر في القرآن) ’’قرآن پاک میں مہارت رکھنے والا عظیم فرشتوں کے ساتھ ہوگا‘ اور جو شخص قرآن کو اٹک اٹک کر دشواری کے ساتھ پڑھتا ہو تو اس کے لیے دوگنا اجر ہے‘‘۔ لہٰذا راجح قول کے مطابق اس روایت کا مطلب یہی ہے کہ جو شخص قرآن مجید کے ذریعے خود کو باثروت نہ سمجھے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ لہٰذا فرمایا کہ قرآن سے بڑھ کر کوئی غنا نہیں ہے اور قرآن حاصل ہونے کے بعد کوئی محرومی نہیں ہے۔ ایک روایت عموماً بیان کی جاتی ہے‘ لیکن کسی معتمد کتاب میں نظر سے نہیں گزری‘ وہ یہ کہ: ’’جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کی دولت عطا کی اور پھر اس کا یہ گمان ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی دوسرے پر اس سے بڑی نعمت کر رکھی ہے تو اس نے قرآن کی قدر نہیں کی‘‘۔ یہی بات یہاں بیان کی گئی ہے۔

۞ إنّکم اتخذتم قراءۃ القرآن مراحلَ‘ وجعلتم اللیل جملًا ‘ فأنتم ترکبونہ فتقطعون بہ مراحلہ ‘ وإنّما کان قبلکم رأون رسائل من ربہم‘ فکانوا یتدبّرونہا باللیل‘ وینفذونہا بالنہار۔ ’’تم نے قرآن مجید کی قراءت کو سفری مراحل سمجھ لیا ہے‘ اور راتوں کو اونٹ کے قائم مقام بنا لیا ہے‘ چنانچہ تم ان راتوں پر سوار ہوتے ہو‘ اور اس کے ذریعے قرآن مجید کے مراحل طے کرتے ہو‘ حالانکہ تم سے پہلے لوگ یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معاملہ یہ تھا کہ وہ قرآن کو اس حیثیت سے دیکھتے تھے کہ وہ ان کے رب کی طرف سے پیغامات ہیں‘ چنانچہ وہ رات میں قرآن پر تدبر کرتے تھے اور دن میں اس کو خود پر نافذ کرتے تھے۔‘‘

یعنی لوگوں نے قرآن مجید کے حوالے سے یہ سمجھ لیا ہے کہ بس اس کی تلاوت کرنا ہی ہماری ذمہ داری ہے‘ اور چوں کہ تلاوت کی زیادہ فضیلت رات کے وقت قیام اللیل میں ہوتی ہے اس لیے وہ فرما رہے ہیں کہ لوگ محض تلاوت کو ایک ذمے داری سمجھ کر راتوں میں قرآن مجید پڑھتے ہیں‘ جیسے ہر رات ایک منزل پوری پڑھ کر سات دنوں میں ختم کر لیا۔ تنقید اس بات پر ہے کہ بس قرآن مجید کی ایک رسمی تلاوت باقی رہ گئی ہے کہ مجھے اتنی راتوں میں قرآن ختم کرنا

ہے‘اسی کا ذوق وشوق ہے‘جب کہ تدبر اور عمل کرنے میں کمی ہے۔

ایک اور جگہ فرمایا:أنزل القرآن؛ ليعمل به‘ اتخذ الناس قراءته عملًا۔’’قرآن مجید کو اس لیے نازل کیا گیا تھا تا کہ اس پر عمل کیا جائے‘لوگوں نے اس کی قراءت کو ہی کل عمل سمجھ لیا‘‘۔یعنی قرآن مجید اس لیے نازل کیا گیا تھا کہ لوگ اس کو اپنا امام‘پیشوا اور زندگی کا لائحہ عمل بنائیں‘لوگوں نے قرآن کی نسبت سے تلاوت ہی کو عمل کا درجہ دے دیا کہ بس اس کو پڑھتے ہی رہو‘اس کے متعلق یہی عمل باقی رہ گیا۔ختم قرآن ان کا مقصود بن چکا ہے‘اور پڑھتے چلے جا رہے ہیں‘ٹھہر کر غور وفکر نہیں کر رہے۔جب کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رات میں قرآن پڑھتے تھے تو اس پر غور وفکر کرتے تھے‘اور دن میں قرآن کو خود پر یعنی اپنے معاملات اور معیشت پر نافذ کیا کرتے تھے‘الغرض مکمل زندگی احکام قرآنیہ کے مطابق بسر کیا کرتے تھے۔

۞ الدنيا كلّها ظلمة إلّا مجالس العلماء۔’’دنیا پوری کی پوری اندھیر ہے سوائے علماء کی مجالس کے‘‘۔یہ حقیقت ہے کہ دنیا تو اجاڑ اور ویرانی ہے‘اصل چیز علم ہے‘اور یہاں العلم سے مراد قرآن وسُنّت یعنی وحی کا علم ہے۔ لہٰذا دنیا اندھیر ہے۔اقبال نے بھی کہا:

گماں آباد ہستی میں‘ یقیں مردِ مسلماں کا
بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی

یعنی دنیا تو اندھیر اور اجاڑ ہے‘اس میں روشنی کی قندیل وحی یعنی قرآن وسُنّت ہے۔اسی علم کا بیان علماء کی مجالس میں ہوتا ہے۔

حضرت مالک بن دینارؒ نے سیّدنا حسن بصریؒ سے پوچھا:ماعقوبة العالم إذا أحبّ الدنيا؟ قال الحسن : موت القلب۔’’عالم اگر دنیا کی محبّت میں مبتلا ہو جائے تو اس کی سزا کیا ہے؟ فرمایا کہ اس کا دل مردہ ہو جاتا ہے‘‘۔ایک روایت میں بھی اسی طرح کی بات ہے:ما أخذ العلم من قلوب العلماء؟ الحرص‘ فإذا أحبّ الدنيا طلبها بعمل الآخرة ‘ وعند ذلك ترحّل عنه بركات العلم‘ ويبقى عليه رسمهُ۔’’کون سی چیز ہے جو علماء کے دلوں سے علم کو نکال دیتی ہے؟ دنیا کی چیزوں کی حرص علماء کے دلوں سے علم کو نکال دیتی ہے۔جب وہ دنیا سے محبّت کرتا ہے تو آخرت کے عمل کے ذریعے دنیا کو طلب کرنے لگتا ہے‘اور پھر اس کے پاس علم کی صورت اور الفاظ باقی رہ جاتے ہیں‘اور علم کی برکتیں اس سے رخصت ہو جاتی ہیں‘‘۔جب اپنی دین داری‘اپنی دینی شہرت‘یا اپنے دینی علم کو دنیا کے حصول کا ذریعہ بناتا ہے تو اس سے علم کی برکتیں رخصت ہو جاتی ہیں۔یہ بہت اہم بات ہے‘ اپنے دین کو دنیا طلبی کے لیے استعمال کرنا بہت خطرناک رویّہ ہے۔اس دور میں یہ چیز بہت ہی زیادہ بڑھ گئی ہے‘ دین بھی ذریعۂ تجارت بن گیا ہے‘دین کو بھی بیچنے اور خریدنے جیسی چیز بنا لیا گیا ہے‘اسے بھی لوگ اپنی جاہ ومنزلتِ دنیاوی حاصل کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

۞ ما عجبت من شيء كعجبي من رجل لا يحسب حبّ الدنيا من الكبائر‘ وأيم الله! إنّها من أكبر الكبائر ۔’’مجھے کسی چیز پر اتنا تعجب نہیں ہوتا جتنا تعجب مجھے کسی ایسے آدمی پر ہوتا ہے جو دنیا کی محبّت کو کبائر میں

شمار نہیں کرتا' اور اللہ گواہ ہے کہ دنیا کی محبّت تو اکبر الکبائر ہے''۔ دنیا کی ایک محبّت تو فطری ہے جس کے بارے میں قرآن مجید میں آیا ہے: ﴿وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۝﴾ (العادیات) ''اور حقیقت یہ ہے کہ وہ مال کی محبّت میں بہت پکا ہے''۔ ﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ﴾ (آل عمران: ۱۴) ''لوگوں کے لیے ان چیزوں کی محبّت خوشنما بنادی گئی ہے جو ان کی نفسانی خواہش کے مطابق ہوتی ہے' یعنی عورتیں' بچے' سونے چاندی کے لگے ہوئے ڈھیر' نشان لگائے ہوئے گھوڑے' چوپائے اور کھیتیاں۔''

محبّت ایک خاص حد تک ہونا تو فطری معاملہ ہے' لیکن اگر وہ محبّت اتنی آگے بڑھ جائے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور جہاد کی محبّت پر غالب آجائے تو یہاں اس حب دنیا کو اکبر الکبائر کہا گیا ہے۔ جیسا کسی بزرگ نے فرمایا کہ ترکِ دنیا مقصود نہیں بلکہ ترکِ حبِ دنیا مقصود ہے۔ دنیا کو ترک کرنا ممکن بھی نہیں' اور لازمی بھی نہیں ہے۔ تو فرمایا کہ مجھے تعجب ہوتا ہے اس شخص پر جو دنیا کی محبّت کو کبائر میں شمار ہی نہیں کرتا۔ اللہ کی قسم' اللہ گواہ ہے کہ دنیا کی محبّت تو اکبر الکبائر میں ہے' وہ تو کبائر کی جڑ ہے۔

ایک روایت اگرچہ سند کے اعتبار سے رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں ہے' لیکن ایک ماثور قول کے طور پر وہ بات بالکل ٹھیک ہے: حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيْئَةٍ۔ ''دنیا کی محبّت ہر خطا کی جڑ اور بنیاد ہے''۔ (حلیة الاولیاء وطبقات الاصفیاء) یہ جملہ ایک موضوع حدیث کے طور پر مشہور ہے' لیکن کچھ جملے ایسے ہوتے ہیں کہ اگر وہ اپنی اصل میں پیغمبر ﷺ سے ثابت نہ بھی ہوں تب بھی وہ ٹھیک ہوتے ہیں۔ موضوع حدیث کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اصلاً وہ بات یا اس کا مضمون ہی غلط ہے' بلکہ موضوع کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ حدیث موضوع علی النبی ﷺ ہے' نبی کریم ﷺ سے غلط طور پر منسوب کی گئی ہے' اسی لیے احادیث موضوعہ پر مشتمل کتب (جن میں جعلی روایات جمع کی جاتی ہیں) پڑھی جائیں تو کئی موضوع احادیث پر ائمہ حضرات تعلیقات کرتے ہیں کہ: هذا حديث موضوع' لكنّ معناه صحيح۔ ''یہ حدیث موضوع ہے لیکن اس کا معنیٰ ٹھیک ہے''۔ یعنی جو بات اس میں بیان کی گئی ہے وہ صحیح ہے۔ اس لیے یہ قول بھی حدیث موضوع ہے: مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ۔ ''جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اُس نے اپنے رب کو پہچان لیا''۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ سیّدنا علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے' لیکن یہ بھی ٹھیک نہیں ہے' بلکہ یہ ابوسلیمان دارانیؒ کا قول ہے' اور اس کا مضمون بھی شریعت کے مطابق ہے۔ اسی لیے مذکورہ روایت: حبّ الدنیا رأس کل خطیئة اگرچہ آپ ﷺ سے منقول نہیں لیکن حقیقت یہی ہے۔

۞ هل تشبّهت الكبائر إلّا من أجلها' وهل عبدت الأوثان' وعصي الرحمٰن إلّا لحبّ الدنيا وإيثارها۔ ''کبیرہ گناہوں کی جتنی بھی شاخیں نکلی ہیں حُبِّ دنیا کی وجہ سے ہی نکلی ہیں' اور اسی دنیا کی محبّت اور ترجیح کے سبب بتوں کی پوجا پاٹ اور رحمٰن کی نافرمانی کی گئی''۔ اس میں کوئی شبہ ہی نہیں' آپ کسی بھی خرابی کا تجزیہ کرتے چلے جائیں تو نتیجہ یہی سامنے آئے گا کہ ساری کمزوریوں کی جڑ دنیا کی محبّت ہے' اسی حُبِّ دنیا کی وجہ سے یہ چیزیں جڑ پکڑتی ہیں۔

۞ إنّ الموت فضح الدنيا' فلم يترك لذي لبٍّ فرحًا۔ ''موت نے تو دنیا کو باطل کر کے رکھ دیا' تو کسی عقل

مند آدمی کے لیے فرح کا کوئی امکان ہی نہیں چھوڑا''۔ فَضَحَ کے ایک معنیٰ تو رسوا کرنے کے آتے ہیں' لیکن ایک معنیٰ تردید کر دینے یا باطل کر دینے کے بھی آتے ہیں' جسے انگریزی میں کہا جاتا ہے ایکسپوز کرنا' یہاں یہی دوسرا معنیٰ مراد ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو واقعتاً یہ بہت اہم بات ہے' خواہ مخواہ دنیا کو زیادہ اہمیت دینا یا اس کو جمع کرنا اس اعتبار سے بالکل فضول ہے' انسان کے لیے سب سے بڑا حقیقی المیہ موت ہے۔ موت نے تو دنیا کی حقیقت کھول کے سامنے رکھ دی ہے' دنیا کو باطل ثابت کر دیا ہے' لہٰذا اس موت نے دنیا میں کسی عقل مند آدمی کے لیے فرح کا کوئی امکان ہی نہیں چھوڑا۔ کس بات پر انسان اکڑتا ہے' کس بات پر شیخی مارتا ہے! ایک ایسی چیز پر جو رخصت ہو جائے گی؟ پھر اس دنیا میں بھی سب سے اہم چیز مال سمجھی جاتی ہے جو جیتے جی بھی کبھی ہوتا ہے اور کبھی نہیں' جیسے اقبال نے کہا:

مَن کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تَن کی دولت چھاؤں ہے' آتا ہے دھن جاتا ہے دھن!

ایک تو مَن کی دنیا ہے جو ایک دفعہ ملتی ہے اور پھر واپس نہیں جاتی' لیکن تن کی دولت چھاؤں کی طرح ہے' آتی اور جاتی رہتی ہے۔ من کی دنیا نفس کی مال داری ہے' اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر استغنا ہو۔ نفس کی تونگری کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انسان اپنے اخلاق اور فضائل میں باثروت ہو' کیونکہ نفس کی کل جمع پونجی انسان کی اپنی نیکیاں اور فضائل ہی ہے۔ بہر حال فرمایا کہ موت نے کسی ہوش مند کے لیے دنیا میں اترانے کا موقع ہی نہیں چھوڑا۔ انسان اس دنیا میں کتنا ہی مال جمع کر لے' آخر کار یہ مال اس سے رخصت ہو جائے گا۔ اگر نہیں ہوا تب بھی اس کا اس دنیا سے رخصت ہونا یقینی ہے۔

۞ وما ألزم عبدٌ قلبه ذكر الموت إلّا صغّرت الدنيا عليه' وهان عليه جميع ما فيها۔ ''جب بھی کوئی بندہ اپنے دل میں موت کی یاد کو لازم پکڑ لیتا ہے تو اس پر دنیا چھوٹی ہو جاتی ہے' (پھر دنیا اس کو عظمت کے پیرائے میں دکھائی نہیں دیتی)' اور جو کچھ اس دنیا میں ہے وہ اس کے لیے ہلکا ہو جاتا ہے''۔ یعنی یہاں کی کامیابیاں اس کو بالکل بے قابو نہیں کرتیں' اور یہاں کی ناکامیاں اس کو بالکل مایوس نہیں کرتیں۔ جیسا کہ یہ مضمون اس آیت میں بھی آیا: ﴿لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۭ﴾ (الحدید: ۲۳) ''یہ اس لیے تاکہ جو چیز تم سے جاتی رہے اُس پر تم غم میں نہ پڑو' اور جو چیز اللہ تمھیں عطا فرما دے اس پر تم اتراؤ نہیں۔''

۞ أصول الشرّ وفروعه ستةٌ' فالأصول ثلاثة: الحسد والحرص وحبّ الدنيا' والفروع كذالك: حبّ الرياسة وحبّ الثناء وحبّ الفخر۔ ''شر کے اصول و فروع یعنی اس کی جڑیں اور شاخیں کل چھ ہیں۔ اصول تین ہیں: حسد' حرص اور دنیا کی محبّت' اور فروعات بھی تین ہیں: بڑا بننے کا شوق' اور تعریف کی محبّت اور فخر کرنے اور شیخی مارنے کی محبّت۔''

ہمارے معاشرے میں بنیادی مسائل بھی یہی ہیں۔ اگر غور کریں تو معلوم ہو گا کہ ہمارے یہاں کیپٹل ازم کا خلاصہ بھی حسد' حرص اور دنیا کی محبّت ہے۔ یہ تمام اشتہاری ادارے خواہشات بانٹنے کی فیکٹریاں ہیں' یہ انسان کے اندر خواہشات کو جنم دیتے ہیں' دنیا میں انسان کی ضرورت تو پوری ہو سکتی ہے لیکن خواہشات کبھی پوری نہیں ہو

سکتیں، جس کے بارے میں اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ ''بنی آدم کے پاس اگر دو وادیاں سونے سے بھری ہوں تو وہ تیسری کا حریص ہوگا''۔ ایک ہو تو وہ دوسری چاہے گا، دو ہیں تو تین چاہے گا، اس کی حرص کبھی ختم نہیں ہوگی۔

۞ لا یزال العبد بخیر ما کان واعظًا لنفسه، وکانت المحاسبة من همّته۔ ''بندہ خیر پر قائم رہتا ہے جب تک اس کے نفس میں ایک واعظ ہے اور اس کی سب سے بڑی فکر محاسبہ کرنا ہے''۔ اللہ نے انسان کے نفس میں ایک واعظ رکھا ہوا ہے جو اس کو وعظ کرتا رہتا ہے، جسے نفس لوّامہ یا ضمیر بھی کہا جاتا ہے۔ اور 'ھمّۃ' فکر، کوشش اور اہتمام کو کہتے ہیں، یعنی اس کی سب سے بڑی فکر اپنے نفس کا محاسبہ کرنا ہو، خود کو تولتا رہے، اور اپنا محاسبہ کرتا رہے۔

۞ ما رأیتُ ظالمًا أشبه بمظلوم من حاسد: نفس دائم، وحزن دائم، وغمّ لا ینفكّ۔ ''میں نے حاسد سے بڑھ کر کوئی ایسا ظالم نہیں دیکھا جو مظلوم سے بہت زیادہ مشابہ ہو، ہمیشہ رہنے والی منافست، دائمی غم اور حزن''۔ یعنی ایک تو ظالم ہوتا ہے جو ظلم و زیادتی کر رہا ہوتا ہے اور دوسرا مظلوم ہوتا ہے جس پر ظلم یا زیادتی کی جارہی ہوتی ہے۔ ظالم کے ظلم کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس کو ظلم کرنے سے کوئی فائدہ حاصل ہو رہا ہے یا کم سے کم لذّت حاصل ہو رہی ہے، جب کہ مظلوم بے چارہ ظلم کی وجہ سے تکلیف میں ہوتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ کسی سے حسد کرنے والا شخص بھی درحقیقت ظالم ہے، لیکن اس ظلم کے باوجود تکلیف میں بے چارہ یہ خود ہی ہوتا ہے، اور حسد کے ذریعے محسود (جو کہ مظلوم ہے) کے مقابلے میں خود کو زیادہ تکلیف دیتا ہے۔ وہ جتنا ظلم دوسرے پر کر رہا ہے اس سے زیادہ ظلم اپنے اوپر کرتا ہے، اس لیے فرمایا کہ حاسد سے بڑا مظلوم میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ وہ ظلم کیا ہے؟ ہمیشہ کے لیے منافست یعنی مقابلہ بازی، ہمیشہ کی پریشانیاں اور اس چیز کا غم کہ یہ مجھ سے آگے نکل گیا، مَیں اس سے پیچھے رہ گیا، اور ایک ایسا غم جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔ یہ بہت اہم نفسیاتی حقیقت ہے کہ ہمیشہ حاسد ہی سب سے زیادہ تکلیف و پریشانی میں ہوتا ہے۔ جس سے وہ حسد کر رہا ہے اس پر تو کیا ظلم کر سکتا ہے، بلکہ وہ اپنے اوپر زیادہ ظلم و زیادتی کرتا ہے۔

۞ ما أطال عبدٌ الأمل إلّا أساء العمل۔ ''کوئی بندہ طولِ امل کا شکار نہیں ہوتا مگر یہ کہ اس کا عمل خراب ہو جاتا ہے''۔ طولِ امل لمبی لمبی آرزوئیں اور تمنّائیں قائم کرنے کو کہتے ہیں، جب کہ ہمیں شریعت میں لغو اور لایعنی مشغولیات سے منع کیا گیا ہے۔ لغو و لایعنی شغل صرف قول اور عمل میں نہیں ہوتا بلکہ یہ شغل خیالات میں بھی ہوتا ہے۔ بلاوجہ بیٹھ کر فضول اور بے فائدہ سوچوں میں مصروفیت، اور امیدوں کے لمبے لمبے محل کھڑے کرنے سے منع کیا گیا ہے، کیونکہ اس سے اللہ اور آخرت کی یاد کا موقع ہاتھ نہیں آتا۔ اللہ کے نبی ﷺ نے انسان کی مثال دیتے ہوئے ایک چوکھٹا بنایا اور اس کے درمیان ایک سیدھی لکیر کھینچی جو اس چوکھٹے سے باہر نکل رہی تھی، اور فرمایا کہ یہ چوکھٹا انسان کی موت ہے اور باہر نکلنے والی لکیر اس کی اُمیدیں ہیں۔ لہٰذا ہماری امیدیں ہمیشہ ہماری زندگی سے زیادہ ہوتی ہیں۔ کچھ لوگوں نے اسی بات سے اخروی دنیا کے حق ہونے پر استدلال بھی کیا ہے، یعنی یہ چیز آخرت کے لیے بہت بڑی دلیل ہے کہ انسان کی آرزوؤں اور تمنّاؤں کے لیے یہ دنیا بہت ناکافی اور چھوٹی ہے، انسان کے اندر یہ آرزوئیں اور تمنّائیں ہونا جو اس دنیا میں سما نہیں سکتیں اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ان تمنّاؤں کے لیے کوئی اور عالم ہو جہاں یہ پوری ہو سکیں، چنانچہ جنّت ایسی جگہ ہے جہاں ہر خواہش پوری ہوگی اور وہ سب کچھ ہوگا جو انسان کا دل چاہے گا۔ لیکن

اس دنیا میں طولِ امل کا شکار ہو جانا اور لمبی لمبی منصوبہ بندی کرنا ٹھیک نہیں۔ آج کل خصوصاً personality development (شخصیت کی ترقّی) کے حوالے سے جو فریب پھیلایا جا رہا ہے یہ طولِ امل ہی کا پرچار ہے‘ بس اپنے سہانے مستقبل کے لیے خواب دیکھتے رہو‘ اور خواب بھی دنیا کے متعلق! کوئی خواب آخرت سے متعلق نہیں ہوتا۔ اور جب انسان اس چیز کا شکار ہو جاتا ہے تو وہ برائیوں میں پڑ جاتا ہے‘ پھر اس کا عمل صالح نہیں رہتا۔

۞ قد كان الرجل يطلب العلم فلا يلبث أن يرى ذلك في تخشّعه وهديه وفي لسانه وبصره وبذّه ۔ ’’ایک آدمی علم کی طلب میں لگ جاتا ہے اور زیادہ وقت نہیں گزرنے پاتا مگر یہ کہ وہ علم نظر آنے لگتا ہے‘ یعنی اس علم کے اثرات‘ اس کے تخشّع‘ اخلاق‘ زبان‘ نگاہ اور سلوک میں ظاہر ہونے لگتے ہیں‘‘۔ هَدْيٌ کا لفظ اخلاق کے لیے بولا جاتا ہے‘ لفظ صمت کا استعمال بھی ان ہی معنوں میں ہوتا ہے۔ اور اخلاق بھی خاص کر وہ جو الفاظ‘ نگاہ اور معاملات میں ظاہر ہوتے ہیں‘ محض باطنی اخلاق کے لیے اس کا استعمال نہیں ہوتا۔

اس قول کا مطلب یہ ہے کہ علم کے اثرات انسان کی شخصیت پر ظاہر ہوتے ہیں‘ اور پھر یہی چیزیں ادب میں ڈھل جاتی ہیں۔ ہمارے اکابرین فرماتے تھے کہ ہم زیادہ علم سے بڑھ کر تھوڑے ادب کے زیادہ محتاج ہیں۔ یعنی ہمیں علم کی اتنی ضرورت نہیں جتنی ادب کی ضرورت ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ اور دیگر اکابرین کے درسِ حدیث کے حلقوں میں ہزاروں کا مجمع ہوتا تھا‘ جب کہ فنی انداز میں علم حدیث سیکھنے والے طلبہ کی تعداد چند سو ہوا کرتی تھی‘ باقی لوگ تو ادب سیکھتے تھے کہ ایک عالم کا اٹھنا بیٹھنا‘ کلام کرنا اور اس کا رویّہ کیسا ہوتا ہے۔

سیّدنا حسن بصریؒ یہ دعا بار بار دہرایا کرتے تھے: اللهمّ لك الحمد على حلمك بعد علمك‘ ولك الحمد على عفوك بعد قدرتك۔ ’’اے اللہ! تیری تعریف ہے تیرے علم کے بعد تیرے حلم پر‘ اور تیرا شکر ہے اس پر کہ ہم پر قدرت حاصل ہونے کے باوجود تُو ہمیں معاف کر دیتا ہے‘‘۔ کیا ہی خوب صورت مضمون ہے‘ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو سب دیکھتا اور جانتا ہے‘ وہ غافل بھی نہیں‘ لیکن اس کے باوجود پکڑ بھی نہیں کر رہا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بہت حلیم ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ وہ قدرت بھی رکھتا ہے‘ جب چاہے پکڑ لے‘ جب چاہے گرفت کر لے‘ لیکن اس کے باوجود وہ معاف کر دیتا ہے‘ یہ اس کی عظمت شان ہے۔ ورنہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے علم اور قدرت کی بنا پر ہمارے خلاف فوری کارروائی کرے تو پھر ہمارے لیے زندہ رہنے کی مجال ہی نہیں ہے۔ قرآن مجید میں بھی فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ان کی خطاؤں پر فوری پکڑنے لگے تو زمین کے اوپر کوئی جاندار چلتا پھرتا نظر نہ آئے۔

۞ ما رأيتُ يقينًا لا شكّ فيه أشبه بشكّ لا يقين فيه إلّا الموت۔ ’’میں نے موت کے علاوہ کوئی ایسی چیز نہیں دیکھی جو بالکل یقینی اور غیر مشکوک ہونے کے باوجود ایسے شک سے مشابہت رکھتی ہے جس میں کوئی یقین نہیں‘‘۔ یعنی یہ یقین ہونے کے باوجود کہ موت ضرور آنی ہے‘ اگر لوگوں کے کرتوت دیکھے جائیں تو ایسا لگتا ہے کہ ان کے نزدیک موت محض وہم ہے اور قابلِ یقین نہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ انسان اپنی موت کو سامنے رکھ کر اس کے بعد والی زندگی کو اپنا نصب العین بنائے‘ لیکن لوگ موت کی حقیقت کو وہم کی طرح ٹال کر دنیاوی زندگی کو اپنا نصب العین بناتے ہیں۔ سیّدنا علی ؓ نے فرمایا: الناس نيام‘ إذا ماتوا انتبهوا۔ ’’لوگ سو رہے ہیں‘ جب مرنے

لگتے ہیں تو ہوش میں آتے ہیں‘‘۔(الاسرار المرفوعة لملا علي القاري‘ حرف النون)اسی طرح ایک روایت میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں:ما رأيتُ مثل النار نام هاربها ، ما رأيتُ مثل الجنّة نام طالبها۔(سنن الترمذي‘أبواب صفة جهنم‘باب منه أي باب ما جاء أن للنار نفسين) ’’میں نے جہنّم جیسی کوئی چیز ایسی نہیں دیکھی کہ جس سے بھاگنے والا سو رہا ہے‘اور میں نے جنّت جیسی کوئی چیز ایسی نہیں دیکھی جس کا طلب کرنے والا غفلت میں پڑا سو رہا ہے۔‘‘

لہٰذا یہاں فرمایا کہ موت جو یقینی چیز ہے اس سے زیادہ شک والی چیز کوئی نہیں رہی‘اور اب تو معاملہ یہ ہو گیا کہ ہم موت کا ذکر تک اپنی زبانوں پر نہیں لانا چاہتے۔بچپن ہی سے ہمیں یہ تربیت دی جاتی ہے‘بچّوں کو کسی جنازے کے ہمراہ نہیں لے جاتے‘اگر وہ موت کا تذکرہ کر بیٹھیں کہ ہمارے ٹیچر نے بتایا ہے کہ ہم سب مر جائیں گے تو ان کی مائیں بھی انہیں اس طرح کی باتیں کرنے سے منع کر دیتی ہیں۔یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے منع کیا جاتا ہے۔ جدید آدمی نے موت کو ایک ممنوع الذکر شے بنا دیا ہے کہ اس کا ذکر نہیں کرنا‘اس کو اپنے سے دور رکھنا ہے۔

۞ لأن أقضي حاجةً لأخ لي أحبّ إليّ من عبادة السَّنة۔’’میں اپنے کسی بھائی کی کوئی ضرورت پوری کروں یہ مجھے زیادہ محبوب ہے اس سے کہ میں ایک سال کی عبادت کروں‘‘۔یعنی مجھے ایک سال کی عبادت سے زیادہ محبوب یہ بات ہے کہ میں اپنے مسلمان بھائی کی کوئی ضرورت پوری کروں۔عام طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ دین کی دو بڑی شاخیں ہیں:ایک ذوقِ عبادت اور دوسرا حسنِ معاشرت‘اور دونوں کا اپنا اپنا منفرد مقام ہے‘اس لیے ایک چیز کی جگہ دوسری چیز کو نہیں دینا چاہیے‘ایسا نہ ہو کہ انسان عبادات میں اتنا غرق ہو جائے کہ لوگوں کے معاملات سے ہی غافل ہو جائے۔حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک مشہور روایت ہے کہ وہ اعتکاف میں بیٹھے تھے‘اس دوران ایک آدمی ان کے پاس آیا اور کہا کہ مجھے فلاں حاجت درپیش ہے‘چنانچہ وہ اس شخص کی حاجت پوری کرنے کے لیے نکل پڑے۔کسی نے کہا کہ آپ تو اعتکاف میں ہیں‘تو فرمایا کہ میں کسی مسلمان بھائی کے ساتھ چل کر اس کی کوئی ضرورت پوری کروں‘یہ مجھے زیادہ محبوب ہے اس سے کہ میں اتنے سال اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مسجد میں اعتکاف کروں۔لہٰذا دونوں چیزوں کو ساتھ ساتھ رکھنا چاہیے۔

ایک صاحب نے حسن بصریؒ سے درخواست کی: إنّي أريد سفرًا فزوّدني۔’’میرا سفر کا ارادہ ہے‘آپ مجھے زادِ راہ فراہم کیجیے‘‘۔یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سُنّت ہے‘صحابہ کرامؓ کا معاملہ بھی یہ تھا کہ جب وہ سفر کا ارادہ کرتے یا سفر کے لیے جاتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے کہ آپ کوئی نصیحت فرمائیے۔یہاں زادِ راہ سے مراد کوئی کھانے پینے کی اشیاء یا روپیہ پیسہ نہیں‘بلکہ سورۃ البقرۃ‘ آیت ۱۹۷ ﴿فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى﴾ ’’کیونکہ بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے‘‘ پر عمل کرتے ہوئے کوئی صاحب ان سے عرض کر رہے ہیں کہ میں سفر پر جا رہا ہوں‘کوئی نصیحت کر دیجیے‘تاکہ میں اسے زادِ راہ کے طور پر اپنے پلے سے باندھ لوں۔تو فرمایا:ابن أخي! أعزّ أمر الله حيث ما كنتَ يعزّك الله عزّوجلّ۔’’اے میرے بھتیجے! جہاں کہیں تم ہو‘اللہ کے امر کو‘اللہ کے حکم کو عزیز رکھو‘غالب رکھو‘تو اللہ تعالیٰ تمہیں عزّت و مرتبہ دے گا‘‘۔اگر دنیا میں مرتبہ اور عزّت چاہتے ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے

کہ اللہ کے معاملے کو اہمیت دو۔ اقبال کا شعر ہے:

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دَیر
بحق دل بند و راہِ مصطفیٰؐ رو!

اگر اس بت کدے (یعنی اس دنیا) میں اگر تم کوئی مقام حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنا دل اللہ تعالیٰ سے لگالو اور رسول اللہ ﷺ کے رستے پہ چل پڑو۔ یہی طریقہ ہے عزّت، مرتبے اور مقام کا۔

۞ إنّ الإيمان ليس بالتحلّى ولا بالتمنّى، وإنّما الإيمان ما وقر فى القلب وصدّقه العمل۔ ''ایمان کسی تزین اور دکھاوے کا نام نہیں ہے اور نہ ہی یہ تمنّاؤں کا نام ہے، اصل ایمان تو وہ ہے جو دل میں قرار پکڑ لے اور عمل اس کی تصدیق کرے''۔ تحلّی تزین کو کہتے ہیں، کسی چیز کے ذریعے خود کو مزیّن کرنا، اسی سے حِلیۃ بنا ہے، جس کو زیور کہتے ہیں۔ حسن بصریؒ کے فرمان کے مطابق ایمان کی مثال ایسی ہی ہے جیسے علم منطق میں علم کی تعریف کی جاتی ہے کہ علم تصوّر اور تصدیق کے مجموعے کا نام ہے، لہٰذا ایمان کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ دل میں گہرا اتر جائے اور پھر انسان کا عمل بھی اس کی تصدیق کرنے والا ہو۔ اگر ایمان محض دل میں راسخ ہے لیکن عمل میں نہیں تو یہ بات بھی ٹھیک نہیں، یا عمل میں ہو لیکن دل میں راسخ نہ ہو تو منافقین کے ساتھ مشابہت ہے کہ بظاہر تو دین پر عمل کر رہے ہیں لیکن دل میں ایمان نہیں۔

۞ الرجاء والخوف مطيتا المؤمن۔ ''خوف اور رجاء مؤمن کی دو سواریاں ہیں''۔ اگر آپ قرآن و حدیث اور اسی طرح ہمارے اکابرین کے اقوال پڑھیں تو جتنی بھی اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں، مثلاً سلوک، مذہب، شریعت اور طریقت، سب میں بنیادی تصوّر سفر کا ہے۔ اقبال کا بھی ایک شعر ہے:

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات، ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں!

یہ زندگی ذوقِ سفر ہے، اللہ کی طرف سفر کرنا نصب العین ہے، سالک کا لفظ بھی اسی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ ہم نے ایک سلوک یعنی سفر طے کر کے اللہ تک پہنچنا ہے، انسان کی منزل اللہ تعالیٰ ہے، اور اس منزل میں تمہاری سواری دو چیزیں ہیں: خوف اور رجاء۔ جس کو امام غزالیؒ نے 'جناحا طیر' کہا ہے، یعنی یہ دونوں چیزیں پرندے کے دو پروں کی مانند لازم ہیں۔ اگر بندۂ مؤمن کے سفر کی مثال اڑان سے دی جائے تو ان دونوں چیزوں کو پرندے کے دو پروں سے تشبیہ دی جاتی ہے، اور اگر زمینی سفر سے مثال دی جائے تو انہیں سواری سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ الغرض خوفِ خدا اور امیدِ نجات، ان دونوں کے درمیان رہنا لازمی ہے۔

خوف اور رجاء سے متعلق ایک قول سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے: ''اگر آسمان سے یہ ندا لگائی جائے کہ تمام لوگ جنّت میں چلے جائیں گے سوائے ایک شخص کے، تو مجھے یہ اندیشہ ہوگا کہ کہیں وہ ایک شخص میں ہی نہ ہوں، اور اگر یہ ندا ہو کہ تمام لوگ جہنّم میں جائیں گے سوائے ایک کے، تو میں یہ امید رکھتا ہوں کہ میں ہی وہ ایک آدمی ہوں''۔ اس قول میں خوف اور رجاء کے توسّط کی انتہائی اعلیٰ مثال ہے۔

۞ أفضل العلم الورع والتوكّل۔ ''سب سے افضل علم ورع اور توکّل ہے''۔ اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ علم جب تک زبان کی نوک پر رہے علم نہیں ہوتا' اصل علم وہی ہے جو دل میں اتر جائے۔ مشکوٰۃ' کتاب العلم میں بھی ایک روایت ان ہی کی طرف منسوب ہے کہ انہوں نے فرمایا: اَلْعِلْمُ عِلْمَانِ' فَعِلْمٌ فِي الْقَلْبِ فَذَاكَ الْعِلمُ النافعُ وَعلم على اللِّسَان فَذَاك حُجَّةُ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ عَلَى ابْنِ آدَمَ۔ (مشكاة المصابيح' كتاب العلم' الفصل الثالث) ''علم دو طرح کا ہوتا ہے' ایک علم وہ ہوتا ہے جو دل میں اترا ہوا ہوتا ہے' اور ایک علم وہ ہوتا ہے جو محض نوکِ زبان پر ہوتا ہے۔ وہ علم جو دل میں اترا ہوا ہے علمِ نافع ہے (وہ رویوں میں بھی ظاہر ہوتا ہے)' اور جو علم زبان پر ہی ہوتا ہے وہ آدمؑ کے بیٹے (انسان) کے خلاف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک حجت ہے''۔ اس لیے فرمایا کہ سب سے افضل علم ورع اور توکّل ہے۔ ورع کا لفظ بہت زیادہ احتیاط کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ورع اور تقویٰ کا لفظ ملتا جلتا ہے۔ فرق بس یہی ہے کہ ورع کا تعلق عمل میں احتیاط سے ہے اور زہد یا تقویٰ کا تعلق باطن سے ہے۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ فلاں بہت صاحبِ ورع ہیں' مطلب یہ ہوتا ہے کہ شبہات سے بچتے ہیں' اور ان کی یہ احتیاط عمل میں نظر آتی ہے' جب کہ تقویٰ باطنی چیز ہے۔ اللہ کے نبی ﷺ نے دل کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: التقوىٰ ههنا۔ (صحيح مسلم' كتاب البر والصلة' باب تحريم ظلم المسلم) ''تقویٰ یہاں ہوتا ہے''۔ اس لیے جو صاحبِ ورع ہوتا ہے تو اس کا ورع' رویے اور معاشرت میں نظر آتا ہے۔ اسی طرح توکّل یعنی اللہ پر اعتماد کو بھی افضل علم قرار دیا گیا ہے۔ متعدد مقامات پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اکثر یقین اور توکّل کو ایک جوڑے کے طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔ ریاض الصالحین کے ابتدائی ابواب میں سے ایک باب کا نام ''باب اليقين والتوكّل'' ہے۔ لہٰذا توکّل یقین ہی کی قسم ہے' اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی کے پاس حقیقی علم ہے تو اس سے توکّل بھی لازماً پیدا ہونا چاہیے۔

۞ إنّ القلوب تموت وتحيا' فإذا هي ماتت فاحملوه على الفرائض' فإذا هي أحييت فأدّبوه بالتطوّع۔ ''دل کبھی زندہ ہوتے ہیں اور کبھی مرجاتے ہیں۔ جب تمھیں لگے کہ دل مرنے لگا ہے یا مر رہا ہے تو اس کو فرائض کی بجا آوری پر آمادہ کرو' اور جب دیکھو کہ دل زندہ ہو چکا ہے اور اللہ سے ایک تعلق قائم ہو گیا ہے تو پھر نوافل کے ذریعے اس کی تادیب کرو''۔ یعنی نوافل کی ادائی کر کے اسے ادب سکھاؤ۔ ایک مرتبہ ان کی مجلس میں کسی نے ایک شخص کے لیے فقیہ کا لفظ استعمال کیا تو اس سے پوچھا کہ هل رأيتَ فقيهًا قطّ' إنّما الفقيه الزاهد في الدنيا۔ ''تم نے کبھی کوئی فقیہ دیکھا بھی ہے؟ فقیہ تو وہ ہوتا ہے جو دنیا میں زہد اختیار کرتا ہے''۔ کیا جس نے شریعت میں حلال و حرام کا علم حاصل کر لیا وہ فقیہ ہے؟ فرمایا کہ لگتا ایسا ہے کہ تم نے کبھی کوئی فقیہ دیکھا نہیں ہے۔ اصل فقیہ تو وہ ہوتا ہے جو دنیا میں زہد و قناعت اختیار کرتا ہے۔ فقیہ کے بارے میں حسن بصریؒ ہی کا ایک قول ہے: الراغب في الآخرة' البصير بدنبه۔ ''فقیہ وہ ہوتا ہے جو آخرت کے معاملے میں رغبت کرنے والا اور اپنے گناہوں کی بصیرت رکھنے والا ہو''۔ اور کچھ روایتوں میں ہے کہ حسن بصریؒ نے یوں فرمایا: البصير بدينه' المداوم على أمر ربّه۔ ''اپنے دینی معاملات یا دین کے بارے میں بصیرت رکھنے والا اور اپنے رب کی بندگی میں مداومت اختیار کرنے والا شخص فقیہ ہوتا ہے۔''

اب بدقسمتی سے علم کا تعلق حافظے سے جوڑا جاتا ہے‘ اس لیے بڑا عالم وہی شمار ہوتا ہے جس کو زیادہ مسائل سے واقفیت ہو۔ ہمارے اکابرین نے بار بار اس تصور کی نفی کی ہے کہ اصل فقاہت یہ نہیں‘ بلکہ اصل فقاہت تو یہ ہے کہ انسان کو دنیا کی سمجھ آ جائے یا دنیا کی حقیقت اس پر کھل جائے۔ قرآن کریم میں ہے: ﴿فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ﴾ (الأنعام:۱۲۵) ’’غرض جس شخص کو اللہ ہدایت تک پہنچانے کا ارادہ کر لے‘ اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے‘‘۔ اس کے ضمن میں اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: ’’جب ایمان کا نور کسی کے سینے میں داخل ہو جاتا ہے تو سینہ کھل جاتا ہے‘ اور فراخ ہو جاتا ہے‘‘۔ تو صحابہؓ نے پوچھا: ’’کیا اس کی کوئی علامت بھی ہے؟‘‘ یعنی یہ کیسے معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کے سینے کو اسلام کے لیے کھول دیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَلْإِنَابَةُ إِلٰى دَارِ الْخُلُودِ ، وَالتَّجَافِي عَنْ دَارِ الْغُرُورِ، وَالِاسْتِعْدَادُ لِلْمَوْتِ قَبْلَ الْمَوْتِ)) (مصنف ابن ابي شيبة، كتاب الزهد، ما ذكر عن نبينا ﷺ في الزهد) ’’دارِ غرور (دھوکے کا گھر یعنی دنیا) سے انسان کا جی اٹھ جائے اور آخرت یعنی جنت کی طرف رغبت ہو جائے جو دار الخلود (ہمیشگی کا گھر) ہے‘ اور انسان موت کے آنے سے پہلے موت کی تیاری میں لگ جائے‘‘۔ تو اصل فقاہت اور سمجھ بوجھ یہ ہے۔ اللہ کے نبی ﷺ کا ارشاد ہے: ((اَلْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهٗ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ)) (سنن الترمذي، أبواب صفة القيامة والرقائق والورع) ’’اصل میں ہوش مند اور دانا وہ شخص ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرے‘ اور موت کے بعد آنے والی زندگی کے لیے عمل کرے‘‘۔

نبی اکرم ﷺ کا معمول تھا کہ جب بھی کوئی صاحب اسلام قبول کرتے تو آپ ﷺ انہیں قرآن سکھانے کے لیے کسی دوسرے صحابی کے حوالے کر دیتے۔ چنانچہ ایک صاحب آ کر مسلمان ہوئے تو انہیں بھی قرآن کی تعلیم کے لیے ایک صحابی کے ساتھ بھیج دیا‘ لیکن چند دنوں بعد ہی وہ صحابی حاضرِ خدمت ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ نے جنہیں پڑھانے کی ذمہ داری مجھے سونپی تھی‘ میں نے انہیں تھوڑا ہی پڑھایا تھا کہ وہ چھوڑ کر چلے گئے‘ اور معاملہ یہ ہوا کہ جب ہم اس آیت تک پہنچے: ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝﴾ (الزلزال) ’’چنانچہ جس نے ذرہ برابر کوئی اچھائی کی ہوگی‘ وہ اسے دیکھے گا‘ اور جس نے ذرہ برابر کوئی برائی کی ہوگی‘ وہ اسے دیکھے گا‘‘۔ تو انہوں نے کہا کہ بس میرے لیے یہ کافی ہے‘ اب میں جاتا ہوں۔ اللہ کے نبی ﷺ نے اس بات کو سن کر فرمایا: ((دَعُوهُ فَإِنَّهٗ قَدْ فَقِهَ)) (الجامع لاحكام القرآن/ تفسير القرطبي، سورة الزلزال) ’’اس کو چھوڑ دو‘ وہ تو فقیہ ہو گیا‘‘۔

اس سے بڑی فقاہت کیا ہے کہ انسان یہ بات سمجھ لے کہ میں اللہ کا بندہ ہوں‘ مجھے مرنا ہے اور مرنے کے بعد میری پیشی ہوگی اور محاسبہ ہوگا۔ اصل فقاہت یہ ہے‘ باقی تو بس تکنیکی علم ہے‘ کسی کو زیادہ آتا ہے تو کسی کو کم آتا ہے۔ دعا ہے کہ جو باتیں ہم نے پڑھی ہیں اللہ تعالیٰ ہمیں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

سماج اور مذہب کا ربط و تعلق

جناب خورشید ندیم کے اَفکار کا تنقیدی جائزہ

حلقہ فکر غامدی سے تعلق رکھنے والے معروف دانشور جناب خورشید ندیم کے اخباری کالموں کے موضوعات بعض اوقات خاصے فکر انگیز ہوتے ہیں' تاہم ان کے افکار و نظریات اہلِ علم حضرات کی تنقید کی زد میں رہتے ہیں۔ اس ضمن میں دو مضمون ہدیۂ قارئین ہیں۔ پہلا مضمون جناب محمد اویس شوکت چیمہ کا ہے' جس میں موصوف کے ایک اخباری کالم کے حوالے سے مذہب اور سماج کے بارے میں ان کے افکار کا تعاقب کیا گیا ہے۔ دوسرا مضمون ڈاکٹر محمد امین صاحب (مدیر ماہنامہ البرہان لاہور) کا ہے' جنہوں نے خورشید ندیم صاحب کے ایک دوسرے اخباری کالم کو ہدفِ تنقید بنایا ہے۔

(۱) مذہب' سماج اور خورشید ندیم صاحب کے اَفکار

محمد اویس شوکت چیمہ

سماج اور مذہب کا کیا ربط و تعلق ہے؟ سماجی ارتقاء کے نتیجے میں مذہبی روایت کو کیوں کر تعامل کرنا چاہیے؟ تہذیب اور مذہب ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں یا پھر ایک دوسرے پر حاکم ہے؟ یہ اور ان جیسے کتنے سوالات ہیں جو ماضی قریب کے فکری راہنماؤں کے پیش نظر رہے ہیں۔ پچھلی صدی میں ہمارے ہاں کے جدید تعلیم یافتہ اور غور و فکر کرنے والے ذہین عناصر میں یہ سوالات خاص طور پر بہت مقبول رہے۔ سرسید احمد خان سے لے کر علامہ اقبال تک اور روایتی طبقہ میں مولانا مودودیؒ اور مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنی تحریروں میں ان امور کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ سلیم احمد صاحب کے ہاں بھی سیر حاصل مواد اس حوالے سے ہمیں ان کے مضامین میں ملتا ہے۔ لیکن جیسے جیسے معاشرہ مغربی کنزیومرازم میں مزید بڑھتا جا رہا ہے اور تعلیم و تعلّم محض افادی معاملہ بن کر رہ گئے ہیں' تو ایسے موضوعات میں عوام کی دلچسپی تو کم خیر ہونی ہی تھی' خواص بھی ایسے موضوعات کو کم ہی درخورِ اعتناء گردانتے ہیں۔ ایسے میں محترم خورشید ندیم صاحب کے ہم شکر گزار ہیں کہ وہ وقتاً فوقتاً ایسے موضوعات اپنی تحاریر میں اُجاگر کرتے رہتے ہیں جو مذہب اور سماج کی ہمہ وقت الجھتی گتھیوں کو سلجھانے میں ممد و معاون ہو سکیں۔

اپنے ایک حالیہ کالم میں بھی وہ حال ہی میں نشر ہونے والے معروف ڈرامے کے معاشرتی اثرات اور اس سے پیدا ہونے والی سماجی تقسیم کی وجوہات جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن جس طرح سے اور جس سادگی سے

انہوں نے تاریخی ارتقاء کو ہر چیز پر حاکم بنا کر پیش کیا ہے ان سے اتفاق کرنا مشکل محسوس ہوتا ہے۔ کیا بات اتنی ہی سادہ ہے کہ موجودہ دنیا ایک مسلسل اور آپ سے آپ وقوع پذیر ہونے والے تاریخی عمل کے نتیجے کے طور پر وجود میں آئی؟ وہ تاریخی عمل ایک ارتقاء کا نتیجہ ہے اور اس ارتقاء کے نتیجے میں انسانی معاشرے اور سماج بھی پہلے سے مختلف ہو گئے ہیں؟ اسی کے نتیجے کے طور پر مرد عورت کا روایتی سماجی کردار اب اس دور میں قابلِ قبول نہیں رہا کہ وہ اس دور کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتا تھا' لہٰذا اب ناگزیر ہے کہ وہ معاشرے اور وہ علمی روایتیں اپنی اصلاح کریں جو تاریخ کے اس جبر کو قبول کرنے میں تامل کا شکار ہیں اور خود کو ماضی کا اسیر بنا کر رکھنا چاہتے ہیں؟ کیا واقعتہً بات محض اتنی سی ہے؟ ع اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا؟ اک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے کہ کاش کوئی سلیم احمد آج ہوتا اور وہ اس حوالے سے ہماری رہنمائی کرتا اور ہمیں بتاتا کہ اصل صورتحال بتائی گئی کیفیت سے کس قدر مختلف اور کتنی زیادہ گھمبیر ہے۔ اور کیا اس طرح کے سطحی صُغریٰ کُبریٰ کی بنیاد پر اس نوع کی وسیع الاطلاق تھیوری بنائی جا سکتی ہے؟

بات فی الحقیقت اتنی سادہ نہیں ہے کہ چونکہ دنیا ایک ارتقائی عمل سے گزری اور اس کے نتیجے میں مرد و عورت کے سماجی کردار بدل گئے' کیونکہ مرد اور عورت اب ایک دوسرے کے ہم پلّہ بن چکے ہیں اور چونکہ دنیا نے اب اسی طرح سے چلنا ہے لہٰذا مذہب کو بھی اس حوالے سے اپنی راہنمائی ''تبدیل'' کر لینی چاہیے تھی کہ اس کو بہر حال ہر دَور کی ضروریات کو پورا کرنا ہے۔ ادھر پہلا سوال تو یہی پیدا ہوتا ہے کہ جس فکری ٹکسال میں تاریخ کی برتری کا مذکورہ بالا نظریہ ڈھلا ہے کیا وہ مذہب کو بجز اس کے کچھ بھی حیثیت دینے پر آمادہ ہے کہ وہ محض زمانۂ قدیم کے فکری طور پر نابالغ انسان کی ضروریات کو پورا کرنے کی ایک غیر عقلی اور غیر حقیقی کوشش تھی جو انسانوں کو تقسیم کرتی رہی' اسے علم اور غور و فکر سے دور اور اس کو غلاموں کی سی اخلاقیات کا اسیر کر دیتی رہی ہے؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم کارل مارکس' ہیگل یا انہی کے قبیلے اور ان جیسا تصورِ علم رکھنے والے کسی مفکّر سے انسانی تاریخ کو سمجھیں' انسانی رویوں کی تعبیر کریں اور سماج کے متعلق اپنی آرا قائم کریں اور اس کے ساتھ مذہب اور الہامی تعلیم کی برتری پر بھی اصرار کریں؟ مذہبی روایت تاریخ کی جس تعبیر کو معتبر مانتی ہے اس کی رو سے پیغمبر ﷺ کا زمانہ ''خیر القرون'' ہے اور اس زمانے کے مکین تا ابد ہدایت کے سرچشمے ہیں' جبکہ دوسری طرف اسی زمانے کو جو نام دیا جائے گا اور دیا جاتا ہے اس کو لکھنے سے یہ قلم قاصر ہے۔

موضوع کو ذرا گہرائی میں جا کر دیکھا جائے تو پھر یہ سوال بھی پیدا ہوگا کہ اگر مذہب نے تاریخ کا ساتھ لازماً دینا ہے تو وہ کون سی تاریخ ہے جو خود مذہب تخلیق کرتا ہے؟ پھر یہ سوال اٹھانا بھی بالکل منطقی ہوگا کہ روایتی معاشروں میں مرد اور عورت کے سماجی کردار میں جو فرق تھا وہ کیا محض اس کی جسمانی ساخت میں فرق کی وجہ سے تھا یا اس میں ہر دو کی نفسیاتی بُنت اور اس سے بھی بڑھ کر حیاتیاتی ساخت کو بھی کچھ دخل حاصل تھا؟ یہ آخری بات جو لکھی گئی تو اس حوالے سے تو واقعہ یہ ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ اگر خورشید صاحب کی بتائی گئی تعبیر درست ہے تو عورت کے جسم میں

بچہ پیدا کرنے کا جو میکانزم ہے وہ بھی پھر کسی ''ارتقاء'' کے نتیجے میں ''نیچرل سلیکشن'' کے اصول کے تحت ہی وقوع پذیر کیوں نہیں ہوا ہوگا؟ اور اگر وہ سب کسی خالق کی سوچی سمجھی صناعی کا نتیجہ ہے' اور بلا شبہ ایسا ہی ہے' تو جو خصوصیت عورت کی ذات کا سب سے اہم وظیفہ ہے وہ کیونکر اس کے سماجی کردار کے تعین میں ایک اہم ترین عامل نہیں رہی ہوگی؟ اور وہ کردار اگر آج بھی عورت ہی کے لیے مخصوص ہے تو پھر اس کے سماجی کردار کے تعین میں اس بات کی اہمیت سب سے بنیادی کیوں نہیں ہونی چاہیے؟ مزے کی بات یہ ہے کہ روایتی لوگوں کو تاریخ سے ''ہاری ہوئی جنگ'' لڑنے کا طعنہ اپنی جگہ' لیکن عورت کی اس اہم ترین فطری ذمہ داری کا کوئی قابل عمل ایسا حل کہ اس سے عورت کو حسبِ منشا فرار حاصل ہو جائے آج بھی پیش نہیں کیا جا سکا' تو وہ اسے ہاری ہوئی جنگ لڑنا اسی پہلو سے کہتے ہیں کہ دورِ حاضر کی عورت کو حقوق نہیں ملے' الٹا اس کو ماں بننے اور بچہ پالنے کی مشقت کے ساتھ ساتھ معاش کی دوڑ میں بھی ڈال دیا گیا ہے اور وہ غریب سرپٹ اس دوڑ میں دوڑ دوڑ کر ہلکان بھی ہوتی جاتی ہے اور اس بات پر خوش بھی ہوتی رہتی ہے کہ وہ مرد کے چنگل سے آزاد ہو چکی ہے۔ دل کرتا ہے کہ ''شانہ بشانہ'' کے حمایتی کوئی اس طرح کی بات بھی کبھی کر سکتے کہ بچہ بھی ایک سال مرد اور اس سے اگلے سال عورت پیدا کرے گی۔ ''صد افسوس'' کہ ایسا وہ کبھی نہیں کہہ سکیں گے کہ خالق اللہ ہے اور انسان نہایت حقیر ہے۔

بات جیسے جیسے آگے بڑھتی ہے مزید سوالات ہمارے سامنے آتے چلے جاتے ہیں۔ اگر قوامیت کی بنیاد محض مرد کا کفیل ہونا تھا اور اگر عورت بھی اس کردار میں مرد کے ساتھ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ہو تو فطری طور پر وہ قوام یعنی گھر کی سربراہ بن جائے گی؟ تو کیا ماضی بعید میں لاتعداد خواتین ایسی نہیں گزریں جو معاشی طور پر خود کفیل رہی ہوں؟ تب یہ سوال کیا ان کے حوالے سے کبھی اٹھایا گیا؟ مزید آگے چلیں تو خورشید ندیم صاحب ہمیں یہ تو بتاتے ہیں کہ اگر عورت زیادہ سمجھدار ہو اور گھر کا معاشی بوجھ بھی اس کے کندھوں پر ہو تو وہ قوام بن جائے گی' لیکن وہ یہ نہیں بتاتے کہ اگر دونوں ہم پلہ ہوں تو پھر کیا ہوگا؟ دو ''قواموں'' میں گھر اور بچوں کی جو حالت ہوگی اس کو چشمِ تصوّر میں لانا چنداں مشکل نہیں۔

پھر وہ جس تاریخی ارتقاء کو ایک حجّتِ قاطع (Meta Definer) کے طور پر بیان کر رہے ہیں' بجائے خود اس کی اپنی حیثیت ہی مشکوک ہے اور لاتعداد سوالات اس پر صرف روایتی مفکّرین ہی نہیں جدید لوگوں کی طرف سے بھی اٹھائے جاتے ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ ارتقاء حق کی تلاش کے لیے کی گئی کسی دیانت دارانہ کوشش کے نتیجے میں وقوع پذیر ہوا ہے اور اس میں انسانوں کی ہوائے نفس اور شیطانی القاء کو کچھ دخل نہ رہا ہو۔ خاص طور پر جس طرح سائنس پچھلی صدی میں سرمایہ دار کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہوئی ہے اور سماجی علوم نے جس رخ پر انسان کو ڈال دیا ہے کہ اب مابعد از جدیدیت نہ تو کوئی سچائی' سچائی رہی اور نہ ہی کوئی اخلاق کے معروضی اور متفقہ معیارات' معیارات رہے۔ ایسے میں اس ''علمی و فکری ارتقاء'' کو محض تاریخ کا جبر قرار دے کر گزر جانا اور اس کے معیار پر دین کی تعبیر کی کوشش کا مطالبہ کرنا نہایت خطرناک رویّہ ثابت ہو سکتا ہے کہ جب آپ اپنی بنیادوں کو ناقص قرار

دے کر خود ہی گرا چکے ہوں تو پھر کسی بھی موقف پر اصرار مشکل ہو جاتا ہے اور یہ موقف خود خدا کی ذات پر ایمان اور پیغمبر ﷺ کی ذات کے حوالے سے بھی ہو سکتا ہے۔

فاضل مصنّف گاہے بگاہے ہمیں بجا طور پر یاد کراتے رہے کہ علماء کرام اور دین کے نمائندوں کی اصل ذمہ داری انذار اور معاشرے میں دین کی تعلیم اور باطل کا ردّ ہے' تو روایتی مذہبی حلقے اس حوالے سے جو نقطۂ نظر رکھتے ہیں اسی کو وہ بیان بھی کرتے ہیں۔ جب وہ سماج میں ذمہ داریوں کی اس نئی تقسیم ہی کو باطل اور اس کو انسانی معاشروں کے لیے مہلک گردانتے ہوں تو وہ اسی ''حقیقت'' کو ہی بیان کریں گے۔ ایسے میں ان سے یہ شکوہ کیسا کہ وہ ایک ہاری ہوئی جنگ لڑ رہے ہیں؟ خاص اس مسئلے میں تو علامہ اقبال بھی روایتی حلقوں سے بڑھ کے روایتی ثابت ہوئے کہ وہ بھی ایسی تبدیلی کے خلاف جا بجا اعلان بغاوت کرتے نظر آتے ہیں اور کسی بھی ایسی تعلیم سے اعلانِ براءت کرتے ہیں جو عورت کو اس کی نسوانیت سے محروم کر دے۔ وہ نسوانیتِ زن کا نگہبان نہ تو پردہ کو سمجھتے ہیں اور نہ ہی تعلیم کو' حتیٰ کہ زر کو بھی نہیں' بلکہ فقط مرد کی مردانگی کو' اور عورت کے لیے سماج میں اصل کردار ماں کے روپ ہی میں دیکھتے ہیں ——— ایک ایسی ماں جس کے کاندھوں پر ملّتِ اسلامیہ کے مستقبل کی تربیت کی کٹھن ذمہ داری ہے۔

البتہ معاشرے میں بڑھتی ہوئی قطبیت (polarisation) اور تقسیم در تقسیم کا عمل سب کے لیے لمحۂ فکریہ ہے اور اس کے تدارک کی جو بھی کوشش ہو وہ لائقِ تحسین ہے۔ لیکن جو سماجی تقسیم اس ڈرامے کے حوالے سے دیکھنے میں آئی اس کی وجہ البتہ سماج کی روایت پرستی نہیں' شاید کچھ اور ہے۔ یعنی موجودہ بحث (جو ڈرامے کے حوالے سے سماج میں ہو رہی ہے) میں مذہبی بیانیہ اگر کوئی ہو سکتا تھا تو وہ یہ کہ ایک گناہ پر مبنی حرام زندگی گزارنے والی ہیروئن کیونکر ڈرامے میں سب کے لیے قابلِ قبول تھی؟ اس کا بے وفا ہونا موضوعِ بحث بنایا' پھر معصوم بچے کو چھوڑ کر جانے والی اس کی بے حسی پر مشقِ سخن کی گئی؟ لیکن کہیں بھی اس بات کو بنیاد نہیں بنایا گیا کہ اس کا یہ عمل دینی حوالے سے کس قدر بھیانک ہے۔ یہ بات بہت تشویش کا باعث ہونی چاہیے تھی کہ اس حوالے سے سماج کی حساسیت واضح طور پر کم ہو چکی ہے۔ اس تقسیم کے پیچھے مذہب کا دخل نہ ہونے کے برابر ہے۔ مذہبی لوگ تو اس سب سے یا تو لاتعلق ہیں یا یہ ماتم کرتے پائے گئے کہ ڈرامے پر رونے والے کشمیر پر کیوں نہیں روئے؟ وغیرہ۔ یہ تقسیم' اس کے حوالے سے کیے گئے مباحث اور جو فکری و نظری پوزیشن لی گئی اس کی جڑیں معاشرے میں تیزی سے سرایت پذیر علمی پستی' سٹارڈم' پھکڑ پن' بازاری عشق بازی اور تماش بینی میں تلاش کی جانی چاہئیں۔ وفا اور حیا جیسی اقدار کی یہ تعریفیں اور ان کو جنس کے ساتھ مخصوص کرنا ناسمجھی و کم علمی ہے' نہ کہ روایت پرستی۔

(۲) کیا اَخلاقی قدریں مستقل ہوتی ہیں؟

ڈاکٹر محمد امین

ہمارے دوست مولانا عبدالرؤف صاحب (سیکرٹری جنرل متحدہ علماء کونسل) کا شمار اگرچہ اب 'بزرگوں' میں ہونے لگا ہے لیکن وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو دینی معاملات میں اب بھی نوجوانوں کی طرح متحرک ہیں۔ وہ متجدّدین کی لن ترانیوں سے چڑتے اور مضطرب ہوتے ہیں' خصوصاً جاوید غامدی صاحب اور ان کے شاگردوں کی ہفوات سے وہ بے چین ہو جاتے ہیں اور اگر کچھ اور نہ ہو سکے تو گھنٹوں ٹیلی فون پر بیٹھ کر سوچنے اور لکھنے بولنے والوں کو مہمیز کرتے رہتے ہیں کہ ان کا نوٹس لو اور ان کا ردّ کرو۔

۲۳ مئی ۲۰۲۰ء کے 'دنیا' اخبار میں خورشید ندیم صاحب کا کالم ''کیا اخلاقیات کی انفرادی تعریف ممکن ہے؟'' جب انہوں نے پڑھا تو پریشان ہوئے اور دوسرے بہت سے لوگوں کے ساتھ مجھے بھی بار بار فون کرتے رہے کہ یہ مضمون فوراً پڑھو اور اس کا ردّ لکھو۔ مَیں نے کالم دیکھا تو اس میں کچھ بھی نہ تھا 'بھرتی کا مال' تھا۔ چنانچہ میری رائے یہ تھی کہ اس کا ردّ لکھنا بھی تضییع اوقات ہے' لیکن انہوں نے اس وقت تک میرا پیچھا نہیں چھوڑا جب تک میں نے اس موضوع پر قلم اٹھانے کا وعدہ نہیں لے لیا۔ اب 'جدید عہد' کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ صحافت ایک پیشہ اور ذریعۂ رزق بن گئی ہے' لہٰذا طے کردہ تعداد میں اخبار کے کالم لکھنا اب ایک صحافی کی مجبوری ہے۔ اس میں بعض اوقات کام کی باتیں بھی مل جاتی ہیں' لیکن اکثر 'بھرتی کا مال' ہوتا ہے۔ بعض نظریاتی لوگ اسے اپنے اور اپنے مکتب فکر کے افکار پھیلانے کا ذریعہ بھی سمجھتے ہیں اور بعض شوقیہ یعنی چھپنے کے خواہش مند بھی ہوتے ہیں۔

خورشید ندیم صاحب سوچ کر اور سمجھ سے لکھیں تو اچھے علمی یا 'علمی نما' مضامین لکھ لیتے ہیں' لیکن ان کا یہ مضمون محض کالم کی مجبوری' بسیار نویسی اور فکری انتشار کا مظہر ہے۔ یونانیوں سے لے کر مغرب کے 'فلاسفہ' اور 'اہلِ دانش' میں سے کئی لوگ اخلاقی قدروں کے غیر مستقل ہونے کے قائل ہیں۔ اس کا منبع وہ عقل کو سمجھتے ہیں' جبکہ قرآن حکیم اسے 'ہوائے نفس' سے تعبیر کرتا ہے۔ ان کے اس فکری رویے کی وجہ یہ ہے کہ وہ وحی الٰہی کی ہدایت سے محروم ہیں اور عقل کے گھوڑے دوڑاتے ہیں۔ ہم مسلمانوں میں الحمدللہ یہ مسئلہ موجود ہی نہیں' کیونکہ ہمارے ہاں اخلاق کا منبع وحی ہے' البتہ خود قرآن حکیم عقل اور عرف کی تبعی (subordinate)' ذیلی اور ثانوی حیثیت کو تسلیم کرتا ہے۔ ہمارے اور مغرب کی ملحدانہ فکر و تہذیب کے علمبرداروں میں فرق یہ ہے کہ وہ عقل کو ہر شے پر مہیمن سمجھتے اور وحی کو خلافِ علم و عقل قرار دے کر ردّ کر دیتے ہیں' جبکہ ہم مسلمان وحی کو ہر چیز پر مہیمن سمجھتے ہیں اور عقل و عرف کو تبعی اور ذیلی سمجھتے ہیں۔ اگر عقل و عرف وحی اور مقاصد شریعت کے مطابق ہو تو وہ قابلِ قبول ہے اور اگر اس کے خلاف ہو تو بلا تردّد قابلِ رد ہے۔ لہٰذا کسی اخلاقی قدر کی تعریف کا تعین ہمارے ہاں کوئی مسئلہ ہی نہیں' کیونکہ ایسی ہر چیز کا تعین قرآن و سنّت میں موجود ہے۔ لہٰذا اَخلاق کی کسی قدر کی تعریف کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس پر سر کھپایا جا سکے۔

یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ
ایک علمی اور فقہی جائزہ(۶)

مقالہ نگار: پروفیسر حافظ احمد یارؒ

ان سوالوں کا جواب تو اب ''واللہ اعلم بالصواب'' ہی ہے' کیونکہ نیتوں کا علم تو صرف اللہ تعالیٰ کو ہی ہے۔ البتہ جس طرح اللہ تعالیٰ اپنی قدرتوں سے پہچانا جاتا ہے' اسی طرح آدمی بھی بڑی حد تک اپنی عادتوں اور حرکتوں سے پہچانا جاتا ہے۔

بہرحال یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ہمارے موضوع سے متعلق تو اس سارے قصے میں یہ بات ہے کہ یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ ۱۹۵۳ء میں پہلی دفعہ سیاست میں لایا گیا۔ پھر ۱۹۵۵ء سے وہ دوبارہ دینی اور علمی سے زیادہ سیاسی مسئلہ بنالیا گیا اور اسے ایک دوسرے اہم سیاسی مسئلہ (عائلی قوانین) کے ساتھ شامل کر دیا گیا اور ۱۹۶۱ء میں قانون بن جانے کے بعد سے وہ ایک سیاسی موضوع ہی چلا آیا ہے۔ لیکن ہم اپنی بحث میں اسے علمی اور فقہی نقطہ نظر سے ہی دیکھتے چلے آئے ہیں اور اسی پہلو سے اس کی موجودہ قانونی حیثیت پر مبصرانہ نگاہ ڈالنا ضروری سمجھتے ہیں کہ آخر کار تو وہ دینی مسئلہ ہی ہے۔

○ عائلی قوانین کی دفعہ نمبر ۴ میں اسے جن الفاظ کے ساتھ مقید کیا گیا ہے اس کی اصل انگریزی عبارت اور اس کا مستند قانونی اردو ترجمہ ہم ابھی اوپر بیان کر آئے ہیں۔ اب ہم اس دفعہ پر اس نقطہ نظر سے بات کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس دفعہ کے یہ الفاظِ عبارت کہاں سے لیے گئے ہیں ـــــ اس کی انشاء (drafting) کے پیچھے کس کا ذہن کام کر رہا تھا ـــــ اور قرآن وسنّت کی روشنی میں قانون کے ان الفاظ کے مضمرات کیا ہیں؟

آیئے ذرا درج ذیل عبارت پر نظر ڈالیے:

''مورث کا کوئی ایسا نسبی رشتہ دار جو اس کے ترکہ میں اس کی وفات کے بعد حصّہ پاتا لیکن جو مورث کی وفات سے پہلے ہی فوت ہو گیا' اس کی جگہ اس کا قریب ترین نسبی رشتہ دار لے گا اور وہ مورث کی وفات کے وقت وہی حصّہ پائے گا جو اس فوت شدہ کو ملتا'' ـــــ یہ عبارت ''طلوعِ اسلام'' اپریل ۱۹۵۴ء' صفحہ ۵۸ سے لی گئی ہے اور یہ دسمبر ۱۹۵۳ء میں محمد اقبال چیمہ ایم ایل اے کی طرف سے پنجاب اسمبلی میں پیش کردہ ترمیمی بل کے مسودہ میں (جس پر مقالہ کے ضمیمہ الف میں مفصل بات ہوئی تھی) مزید ترمیم کے لیے تجویز کی گئی تھی' یعنی ''طلوعِ اسلام'' کے نزدیک چیمہ صاحب کا مجوزہ ترمیمی بل ان الفاظ اور اس عبارت کے ساتھ پیش ہونا چاہیے تھا۔ ''طلوعِ اسلام'' والوں کے

اس بدلتے ہوئے موقف اور وراثت میں قائم مقامی کو صرف ''نسبی رشتہ داروں'' تک محدود کرنے کے صریحاً خلافِ قرآن اور محض جاہلانہ تحکّم ہونے پر بھی ہم نے اپنے مقالہ میں مختصراً تنقید کی تھی (دیکھئے مقالہ کے دوسرے حصے میں باب پنجم کے آخر پر صفحہ ۱۰۶' حاشیہ ۱۳) لیکن اب ذرا تفصیل کے ساتھ بات کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

○ آپ اس عبارت کا عائلی قوانین کی دفعہ نمبر ۴ کی عبارت سے آمنے سامنے لکھ کر موازنہ کیجیے۔ ایک ہی مفہوم بلکہ الفاظ بھی قریباً یکساں ہیں۔ یہاں کسی ''نسبی رشتہ دار'' کا مورث سے پہلے فوت ہو جانا بیان ہوا ہے' جبکہ قانون کی دفعہ نمبر ۴ میں ''مورث کے کسی بیٹے یا بیٹی کی موت'' کے الفاظ ہیں۔ اسی طرح اس عبارت میں وراثت آگے مورث کے ''قریب ترین نسبی رشتہ دار'' کو منتقل ہونے کی بات کی گئی ہے' جبکہ دفعہ نمبر ۴ میں ''ایسے بیٹے یا بیٹی کی اولاد'' کو وراثت دینے کا ذکر ہے —— گویا ''نسبی رشتہ دار'' کی جگہ بیٹا بیٹی اور آگے ''ان کی اولاد'' کے لفظ لائے گئے ہیں' اس لیے کہ ''نسبی رشتہ دار'' میں بھی ایک ابہام تھا' اس میں تو پھر ''ماں اور باپ'' بھی آتے تھے' اور یہ پھر وہی ناممکن العمل قائم مقامی کی ایک صورت ہوتی' اس لیے وزارتِ قانون کے ماہر ڈرافٹ نویسوں نے ''بیٹا بیٹی'' اور ''اولاد'' کے الفاظ ڈال کر بات صاف کر دی۔ باقی مضمون یکساں ہے۔ گویا دفعہ نمبر ۴ کی عبارت دراصل مجتہدین کے علمبردار ادارہ طلوعِ اسلام ہی کی تجویز کردہ ہے —— یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ دفعہ نمبر ۴ کی اصل انگریزی نص (قانونی عبارت) میں ''مورث'' کے لیے لفظ ''propositus'' استعمال ہوا ہے' جس کے قانونی معنی صرف ''نسبی مورث'' کے ہیں۔ ڈکشنری میں قانونی اصطلاح کے طور پر اس کے معنی یوں بیان ہوئے ہیں:

"The person from whom a line of descent is derived on a genealogical table"

قرآنی قانونِ وراثت کے مطابق تو ''وارث'' کی طرح ''مورث'' بھی چھ افراد یا رشتہ دار ہو سکتے ہیں' یعنی ماں' باپ' خاوند' بیوی' بیٹا اور بیٹی۔ یہ سب وراثت لیتے بھی ہیں اور ان سب سے وراثت ملتی بھی ہے۔ یہ قرآن کی رو سے بنیادی وارث اور مورث ہیں' ان کا تعلق باہمی متبادل (reciprocal) یا (counterpart) کا سا ہے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی زندہ ہے تو اسے وارث بننے سے اور اگر ''متوفی'' ہے تو اسے مورث (وراثت دینے والا) بننے سے قانوناً روکا نہیں جا سکتا۔ مورث کے ان شرعی معنی سے بچنے کے لیے لفظ ''propositus'' لایا گیا اور پھر مزید تاکید کے لیے وارثوں میں صرف بیٹا یا بیٹی کا ذکر کر دیا گیا۔ گویا ''وہی نسبی رشتہ دار'' کو ہی مورث اور اسی کو وارث بنایا گیا ہے۔ صرف لفظ دوسرے ہیں اور ساتھ تاکیداً ''per stirpes'' کے لفظ لائے گئے ہیں' جس کے معنی ہیں ''for each line of descent'' یا زیادہ قانونی مفہوم کے مطابق for each one from which a family is descended گویا ہر طرف سے ''نسب'' پر ہی زور ہے۔

○ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ عائلی قوانین کی دفعہ نمبر ۴ کی عبارت کی اصل وہی ''طلوعِ اسلام'' والی مجوزہ عبارت ہے۔ اور اسی لیے تو ''طلوعِ اسلام'' نے اپنے اپریل ۱۹۶۱ء والے کنونشن کو عائلی قوانین کے نفاذ پر جشن فتح کے طور پر منایا تھا۔ ادارہ کے اس وقت کے سربراہ غلام احمد پرویز صاحب کے کنونشن سے خطاب کے حسبِ ذیل الفاظ قابلِ غور ہیں:

''برادران گرامی! کس قدر جواں بخت ہے یہ ہمارا دور جس میں چودہ سو سال کے بعد رجعت الی القرآن کی صدائے جمیل نے فضاء میں حسین ارتعاش پیدا کیا۔ کس قدر خوش نصیب ہے یہ خطہ پاک جسے ان آسمانی قوانین کا گہوارہ بننے کی سعادت نصیب ہوئی اور کس قدر مستحق تبریک وتہنیت ہے وہ ثریّا بخت مملکت جس نے دنیا میں پھر سے قرآن کی آواز بلند کی ہے..... الخ'' (دیکھئے طلوعِ اسلام' مئی جون ۱۹۶۱ء صفحہ ۵۴) پرویز صاحب کی یہ تحریر (جسے آپ قلمبہ گوئی کہیں یا پُرشکوہ اسلوب) بہرحال ایک تو اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ پرویز صاحب کا اہلِ علم ہونا متنازعہ فیہ ہوسکتا ہے ان کے اہل قلم ہونے کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ دوسرے یہ عبارت ان کی اس بے پایاں مسرت پر دال ہے جو ان کو عائلی قوانین (اور خصوصاً اس کی دفعہ نمبر ۴) کے حسب مرضی نفاذ سے ہوئی تھی۔

○ اب یہاں اس نقطہ پر توجّہ مرکوز کرنا ضروری ہے کہ کیا طلوع اسلام (یا اس کے بانی مبانی پرویز صاحب) ''یتیم پوتے کی وراثت کے مسئلہ'' پر شروع سے یہی رائے رکھتے تھے جو انہوں نے اقبال چیمہ صاحب کے مجوزہ ترمیمی بل کے مسودہ کی اصلاح کے لیے پیش کی تھی اور جسے عائلی قوانین کی دفعہ نمبر ۴ میں قانونی شکل دیے جانے پر ان کے اندر خوشی سے لڈّو پھوٹنے لگے تھے؟ اس کے لیے ہمیں ایک دفعہ پھر اس قضیے پر ۱۹۱۷ء سے اب تک کے بعض مراحل کو خاص اس پہلو سے یعنی اپنے موقف پر ثابت قدم رہنے یا نہ رہنے کے نقطہ نظر سے دیکھنا پڑے گا' کیونکہ ویسے تو ہم اس داستان کا کچھ حصّہ اصل مقالہ میں اور باقی اس ضمیمہ میں تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں۔

○ ہم مقالہ کے پہلے حصے میں مسئلہ کے ''قدیم پہلو'' کے ضمن میں فقہائے متقدمین (سُنّی شیعہ ہر دو) کا حیرت انگیز حد تک متفقہ اور مجمع علیہ موقف بیان کر چکے ہیں اور یہ بھی بیان کر چکے ہیں (مقالہ کے حصّہ دوم میں) کہ اس موقف کی بنیادی وجہ ''قرآنی قانونِ وراثت میں نظریہ نیابت (قائم مقامی) کا ناممکن العمل ہونا'' ہے۔ ہمارے علماء اس مسئلہ پر ''سلف سے خلف تک کے کامل اتفاق'' کی بات تو کرتے تھے مگر اس ''اتفاق'' اور اجماع کی بنیادی وجہ بیان کرنے سے قاصر رہے یا یہ بات ان کے ذہن میں نہیں آئی۔ بہرحال جب یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ متنازعہ فیہ بنا دیا گیا (جس کی ابتداء ۱۹۱۷ء سے ہوئی اور جس میں زور ۱۹۴۸ء کے بعد سے آ گیا تھا) تو بعض اہل علم کے ذہن میں یہ بات (متفقہ موقف کی بنیاد والی) آئی' جس کا تقریر اور تحریر میں بھی ذکر ہوا اور جس سے استفادہ کرتے ہوئے ہم مقالہ کے حصّہ دوم (باب پنجم) میں بالتفصیل بحث کر چکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے علماء کے موقف کی بنیاد مستحکم تھی۔ اس لیے ان کو اس میں کسی ترمیم یا تبدیلی کی کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی —— اگر قرآن کا قانونِ وراثت برحق ہے تو اس کے نفاذ کے نتیجے میں یہ موقف (محجوب الارث والا) بھی برحق اور اٹل ہے۔

○ اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ متجدّدین کا موقف اس بارے میں بدلتا رہا ہے' بلکہ قلابازیاں کھاتے رہے ہیں۔ اس بارے میں ان کا سارا سرمایہ مولانا اسلم جیراجپوری صاحب کا مقالہ ''محجوب الارث'' تھا جو خود خواجہ احمد الدین امرتسری مرحوم کے مجموعہ رسائل ''الوراثۃ فی القرآن'' سے ماخوذ تھا۔ جیراجپوری صاحب نے یتیم پوتے کے مسئلہ کے حل کے لیے اپنے مقالہ میں اقربیت کا نیا مفہوم پیش کیا تھا (جو ہمارے مقالہ میں زیر بحث آ چکا ہے) ان کے اس نظریہ اقربیت میں اور اس کی تعبیر وتوضیح میں (جس طرح اسے طلوع اسلام نے پیش کیا) دو باتیں بڑی

واضح اور نمایاں ہو کر سامنے آئیں۔

(۱) ''یتیم پوتا (یعنی بھتیجا) اپنے چچا کا بھائی بن کر اپنے باپ کا حصّہ بطورِ وراثت لے سکتا ہے۔''
(دیکھئے مقالہ کا حصّہ دوم' باب دوم کی فصل اوّل' بحوالہ تین اہم مسائل' صفحہ ۱۸۵)

(۲) ''مُردوں کے حصے (وراثت میں) نہیں نکالے جاتے۔ یتیم پوتے (بھتیجے) کو براہِ راست اپنا حصّہ ملتا ہے (بھائی بن کر) نہ کہ اس کے متوفی باپ کا حصّہ'' (دیکھئے مقالہ کا مندرجہ بالا (حصّہ دوم کے باب دوم والا) حصّہ بحوالہ تین اہم مسائل' صفحہ ۱۵۶' ۱۵۷۔)

لیکن جونہی صرف ایک چچا اور ایک بھتیجا (یتیم پوتا) کی بجائے جیراجپوری صاحب کے اس قاعدہ اقربیت کے مطابق ایک چچا یا زیادہ چچاؤں کے ساتھ متعدد بھتیجوں اور بھتیجیوں کا تصوّر سامنے آیا (جو کوئی نادر الوقوع چیز بھی نہیں) تو اس ''اجتہادِ نو'' کی غلطی بلکہ لغویت اور نامعقولیت واضح ہوگئی۔[۳] (دیکھئے اصل مقالہ کے حصّہ دوم کے باب دوم کی فصل اوّل کا آخری حصّہ) چنانچہ متجددین کے اس وقت کے قائد و سربراہ جناب پرویز صاحب بھی اسے سمجھ گئے تھے۔ (اگرچہ جان لینے کے باوجود ظاہراً مان لینے سے گریز کیا۔) اسی لیے انہوں نے چوہدری محمد اقبال چیمہ والے مجوزہ ترمیمی بل کی تعریف کے پل باندھنے کے باوجود چیمہ صاحب کے مسودہ (جس پر ہم نے مقالہ کے ضمیمہ الف میں بات کی ہے) میں وہ ترمیم پیش کی جو ہم نے ابھی اوپر ''طلوعِ اسلام'' اپریل ۱۹۵۴ء کے حوالے سے بیان کر دی ہے اور جو بعد میں عائلی قوانین کی دفعہ نمبر ۴ کی بنیاد بنی۔ حالانکہ مولانا اسلم جیراجپوری صاحب کے جس نظریہ اقربیت کے تختے پر کھڑے ہو کر قائد تجدد اپنا قد (image) بلند کر رہے تھے' اس کے مطابق تو یہ ترمیم یوں پیش کرنی چاہیے تھی ـــــ کہ ''مورث کا کوئی ایسا پوتا' پوتے یا پوتی پوتیاں جس کا باپ/جن کے باپ مورث کی زندگی میں فوت ہو گئے ہوں تو ان کو اپنے چچا / چچاؤں کا بھائی بہن سمجھ کر مورث کی وراثت تقسیم کی جائے گی''۔ اگر عائلی قوانین میں بھی اسی طرح کی قانون سازی ہو جاتی تو پھر پتہ چلتا کہ وکلاء اور عدالتوں کے جج کس طرح سر پکڑ کر بیٹھے نظر آتے۔

خیال رہے کہ جیراجپوری صاحب کے اعتراضات چونکہ حنفی فقہ فرائض پر ہی تھے اس لیے انہوں نے یتیم نواسے یا نواسی (یعنی ماں کی طرف سے یتیم) کو ماموں کے ساتھ بھائی بہن بنا کر حصّہ دینے کی بات نہیں کی تھی (جو عملاً تو شیعہ فقہ فرائض کا مسئلہ ہے' اگرچہ حنفی فقہ میں بھی ان کا درجہ بعد میں بطور اولوالارحام آتا ہے) ـــــ ورنہ اگر اس مجوزہ ترمیم میں یتیم بھتیجوں' بھتیجیوں کو بھائی بہن بنانے کے ساتھ مرنے والی بہن کی اولاد کو بھی زندہ رہ جانے والے ماموں کے ساتھ بھائی بہن بنا دیا جاتا' جو اس نئے نظریۂ اقربیت کا لازمی نتیجہ بنتا ہے' تو کیا ہوتا؟ اس کی دو مثالیں ہم مقالے کے دوسرے حصے کے باب دوم کے آخر میں بیان کر آئے ہیں ـــــ پنجاب مقنّنہ کی طبع کردہ آراء میں اس نامعقول نظریہ کی کچھ مزید مثالیں بھی دی گئی تھیں' جن کے حوالے ہمارے مقالے کے حصّہ دوم کے باب دوم کی فصل دوم میں بھی دیے گئے ہیں۔

○ بہرحال اپنے اس مایۂ ناز نظریہ اقربیت میں پوشیدہ مغالطہ کی حقیقت اور نامعقولیت ظاہر ہوجانے پر متجدّدین (یا طلوعِ اسلام) کو اپنا یہ نظریہ ترمیمی بل میں پیش کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ یہ پہلی قلابازی تھی کہ اپنا بہت تشہیر دادہ موقف بدل لیا۔

یہاں برسبیل تذکرہ یہ بات بھی قابلِ ذکر بلکہ باعثِ تعجب ہے کہ جب عائلی قوانین بن گئے اور اس کی دفعہ نمبر ۴ والا قانون خود ''طلوعِ اسلام'' ہی کی مذکورہ بالا مجوزہ ترمیم کے مطابق ہی تھا اور اسی قانون کی متجدّدین حضرات مدح سرائی بھی کر چکے تھے۔ لیکن جب مارچ ۱۹۸۶ء میں بعض علماء نے عائلی قوانین کے خلافِ قرآن و اسلام ہونے کے مسئلہ کو دوبارہ چھیڑ دیا تو ادارۂ طلوع اسلام نے اپنے اپریل ۱۹۸۶ء کے شمارہ میں ان علماء پر سوقیانہ طعن و تشنیع کی (اگر پرویز صاحب مرحوم زندہ ہوتے تو غالباً وہ اپنی تحریر کا وقار یوں نہ گنواتے)۔ اس شمارے میں صورتِ مسئلہ سمجھانے کے لیے پھر وہی مولانا جیراجپوری صاحب کے مقالہ ''محجوب الارث'' والی مثالیں اور وہی نیا نظریۂ اقربیت (پچھلی فائلوں سے نکال کر) دوبارہ نقل کر دیا گیا۔ حالانکہ یہ لوگ ایوب خانی قانون کو تسلیم کر کے خود ہی اپنی اس ''ہلدی کی گرہ'' کو نامعقول سمجھ کر پرے پھینک چکے تھے۔ پھر اس متروک اور نامعقول بحث کو دوبارہ درمیان میں لانے کا کیا فائدہ؟

○ دوسری طرف پنجاب مقنّنہ کی طبع کردہ پبلک آراء کے سامنے آنے پر ''طلوعِ اسلام'' والوں کو نظریہ قائم مقامی کے قرآنی قانونِ وراثت میں ناقابل عمل ہونے کی بھی سمجھ آ گئی (اس نظریہ قائم مقامی پر بھی مقالہ کے دوسرے حصے میں، باب دوم کی فصل دوم میں مفصل بحث ہو چکی ہے) تو وہ اپنے علی الاعلان بیان کردہ موقف کہ ''سن رکھیے مُردوں کے حصے نہیں نکالے جایا کرتے۔'' (دیکھئے مقالہ کے حصّہ دوم کی فصل اول بحوالہ تین اہم مسائل، ص ۵۷۔۶۵۶) سے بھی منحرف ہو گئے۔ یہ دوسری قلابازی تھی کہ ''فوت شدہ کا حصّہ'' (جو اُس فوت شدہ کو ملتا) نکالنے پر بھی آمادہ ہو گئے۔

○ اور سب سے زیادہ عجیب بات یہ کہ قرآن کریم کے بنیادی چھ وارثوں (ماں، باپ، بیوی، خاوند، بیٹی، بیٹا) میں سے حق وراثت میاں بیوی سے، بلکہ عملاً والدین سے بھی، چھین لینے پر آمادہ ہو گئے اور حق وراثت کو صرف نسبی رشتہ داروں (بیٹا بیٹی) تک محدود کر دیا (کیونکہ قائم مقامی صرف اسی صورت میں چل سکتی ہے)۔ یہ قرآن حکیم کے قانونِ وراثت بلکہ اصولِ وراثت ہی سے صریح بغاوت ہے۔ ہم نے مقالے میں بھی اس خودرایانہ اور جاہلانہ تحکّم پر تنقید کی تھی (دیکھئے مقالہ کے دوسرے حصے کے باب پنجم کا آخری حصّہ)۔ قرآن کریم میں تو ہے کہ ﴿مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ﴾ (النساء:۷) کہ وراثت ماں باپ سے بھی ملے گی اور بعض دوسرے قریبی (الاقربون) رشتہ داروں (مثلاً بیوی، خاوند، بیٹا، بیٹی) سے بھی ——— ''طلوعِ اسلام'' کی نسبی رشتہ داروں والی تجویز (اور پھر اسی پر مبنی عائلی قوانین کی دفعہ نمبر ۴) کے مطابق تو وراثت دینے کا حق صرف والدین کی طرف سے تسلیم کیا گیا ہے۔ الاقربون (جن میں خاوند اور بیوی لازماً شامل ہیں) سے وراثت پانے کے قرآنی حق کا ہی انکار کر دیا گیا ہے ''قرآنی فکر'' کی یہ کون سی قسم ہے؟ کاش کہ اپنے مخالف علماء کو ''منکرینِ قرآن'' کہنے والے (دیکھئے مقنّنہ پنجاب کی پبلک آراء میں

طلوعِ اسلام کے پیش کردہ مضمون میں صفحہ ۵ پر عنوان ''منکرینِ قرآن کی طرف سے جواب'' اپنے گریبان میں بھی جھانک کر دیکھ لیتے۔ اتنی سی بات کو تو آیاتِ میراث کا ترجمہ جاننے والا بھی سمجھ سکتا ہے' اس کے لیے مفکّرِ قرآن ہونا بھی ضروری نہیں۔

○ میاں بیوی کا وراثت میں حصّہ تو قرآن کریم کا اتنا واضح حکم ہے کہ اس کو ترک کرنے کی کوئی تاویل نہیں کی جاسکتی۔ اسی لیے اہل السنّت زوجین کو ذوی الفروض میں رکھ کر سب سے پہلے ان کا حصّہ نکالتے ہیں اور اسی لیے فقہ جعفری میں زوجین کو طبقاتِ ورثاء سے الگ رکھا گیا ہے کہ زوجین ہر طبقہ کے ساتھ وراثت پائیں گے' وہ کبھی محجوب نہیں ہو سکتے۔

○ وراثت کو نسبی رشتہ داروں تک محدود کرنا اور مرنے والے کی بیوہ کو بھی اس سے محروم کرنا تو ایک لحاظ سے ہندو رواجی قانونِ وراثت سے بھی بدتر ہے۔ کیونکہ ہندو قانون کے مطابق بھی بیوہ (خاوند کی اولادِ نرینہ نہ ہونے کی صورت میں) ''تاحیات'' اپنے مرنے والے خاوند کی جائیداد کی مالک متصور ہوتی ہے' البتہ وہ اسے کہیں منتقل نہیں کرسکتی۔ باقی تصرفات (ٹھیکہ' کرایہ' مزارعت وغیرہ) کا اسے حق ہوتا ہے۔ اس کے مرنے کے بعد وہی جائیداد اس کے مرنے والے خاوند کے ''نسبی رشتہ داروں'' کی طرف لوٹ آتی ہے۔ ہندوؤں میں چونکہ بیوہ دوبارہ شادی نہیں کرسکتی اس لیے ان کے ہاں بیوہ کا یہ حق ''تاحیات'' کے ساتھ مقید ہے۔ مسلمانوں کے جن علاقوں میں انگریزوں نے رواجی ہندوانہ قانون اپنانے کی اجازت دے دی تھی (یا جہاں خود مسلمانوں نے شریعت کے مقابلے پر رواجی (ہندو) قانون کو ترجیح دے کر اختیار کیا تھا) وہاں بھی مسلمان بیوہ (خاوند کی اولادِ نرینہ نہ ہونے کی صورت میں) تا ''نکاحِ ثانی'' اپنے مرحوم خاوند کی جائیداد کی مالک اور بیع وانتقال کے سوا تمام تصرفات کی حقدار سمجھی جاتی تھی۔ خیال رہے کہ قرآن کریم کے مطابق تو بے اولاد بیوہ بھی اپنے خاوند سے وراثت کی لازماً حقدار ہے۔

○ امریکہ میں (بہت سے یورپی ممالک کی طرح) الگ قانونِ وراثت نہیں ہے' بلکہ یہ مورث کی وصیت پر منحصر ہے۔ وہاں اگر کوئی آدمی بغیر وصیت کیے مرجائے تو حکومت ہی اس کی ساری جائیداد کی وارث ہوتی ہے۔ البتہ حکومت کے قبضہ کر لینے کے بعد مرنے والے کی صرف بیوہ (جس کے حق میں وصیت بھی نہیں ہوسکی تھی) اپنا کچھ حصّہ حکومت سے طلب کرسکتی ہے' اور اسے کچھ نہ کچھ مل بھی جاتا ہے' مگر مرنے والے کا دوسرا کوئی عزیز (اولاد بھی) وصیت کے بغیر حکومت سے کچھ نہیں لے سکتا۔

ہمارا یہ دو مثالیں بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ میاں بیوی کا تعلق جس مودّت اور رحمت پر مبنی ہے اسے ہندو رواج اور امریکی قانون تک نے تسلیم کیا ہے ـــــ مگر محض بات کی پچ کی خاطر اور ایک issue پر شکست سے بچنے کے لیے یہ ''مفکّرینِ قرآن'' اپنی ''فکرِ قرآنی'' کی ناک پر بھی ضد اور جہالت کا اُسترا چلا دینے سے نہیں جھجکے۔

دنیا کا کوئی غیر مسلم (یہودی عیسائی وغیرہ) عربی دان بھی قرآن کریم کا مطالعہ کرے تو وہ بھی اس نتیجہ پر پہنچ جائے گا کہ ''یہ کتاب بیک وقت والدین' زوجین اور اولاد (بیٹا بیٹی) کو لازماً وارث بناتی ہے اور ان میں سے کسی ایک کو بھی (بوقت تقسیم وراثت زندہ ہوتے ہوئے) کسی طرح محروم نہیں کیا جاسکتا۔ اور یہی وہ چیز ہے جس کی نظیر ادیانِ

عالَم اور انسانی (وضعی) قوانین میں کہیں نہیں ملتی اور اس لیے Von Kremer نے اسلامی قانونِ وراثت کو اسلامی قوانین کی Supremely Original Branch قرار دیا تھا (دیکھئے مقالہ کی تمہید)۔

اور حالت یہ ہے کہ خود ''مفکّرینِ قرآن'' اس عظیم و بے مثل قانون کی اسی ''Originality'' کو ختم کر کے اسے ہندوانہ رواجی قانون کی سطح پر لے آنے پر آمادہ ہو گئے (صرف اس فرق کے ساتھ کہ نسبی رشتہ داروں میں بیٹا بیٹی دونوں کو (قرآن کے مطابق) شامل کر لیا جائے' جبکہ ہندو قانون میں صرف بیٹا وراثت پاتا ہے' بیٹی نہیں) کیا قرآنی قانونِ وراثت بس اتنا ہی ہے کہ بیٹے کے ساتھ بیٹی بھی حصّہ لے گی؟ آگے والدین اور زوجین کا ذکر ہی نہیں ہے؟ یا للعجب!

○ اور پھر قرآن کریم کے اس قانونِ وراثت میں ـــــ جس میں وراثت پانچ طرف سے کسی کے پاس آسکتی ہے اور پھر صاحب جائیداد کے مرتے ہی پانچ مختلف سمتوں میں روانہ ہو جاتی ہے ـــــ اس قانون میں گردشِ زر کا جو اصول ہے اور انسانی معاشرے کے جو معاشی مصالح اس سے وابستہ ہیں اسے یہ ''نظامِ ربوبیت'' کا نعرہ لگانے والے بھی نہ سمجھ سکے یا محض ''بَغْیًۢا بَیْنَهُمْ'' کے ماتحت ہر چیز سے آنکھیں بند کر لیں؟ جب دیکھا کہ قرآنی قانونِ وراثت میں تو اصولِ قائم مقامی کسی طرح چل ہی نہیں سکتا تو ہندوؤں کی طرح (یا دوسرے مذاہب کی طرح) صرف ''نسبی رشتہ داروں'' (یعنی صرف اولاد) کے حق وراثت کے نمائندہ بن بیٹھے' کیونکہ صرف اسی میں قائم مقامی چل سکتی ہے۔ کیا یہ اسی طرح کی سنگدلی نہیں جس کے ماتحت ہمارے جاہل مسلمانوں کو بوڑھی سوتیلی ماں کو یا جوان بے اولاد بیوہ بھاوج کو (جسے نکاحِ ثانی کا حق بھی دیا گیا ہے) قرآنی قانون کے مطابق وراثت میں حصّہ دینا خلافِ عقل اور باعثِ فساد نظر آتا ہے؟

○ آیئے اب عائلی قوانین کی دفعہ (نمبر ۴) پر بھی قرآن ہی کی روشنی میں غور کر لیں۔ اس دفعہ کی انگریزی اور اردو عبارات اوپر بیان ہو چکی ہیں' ذرا ان کو سامنے رکھ لیجیے۔

(۱) اس میں بھی پہلی خلافِ قرآن بات تو یہی ہے کہ قرآنِ کریم کے مقرر کردہ چھ بنیادی وارثوں (والدین' زوجین اور بیٹا بیٹی) میں سے صرف دو (یعنی مرنے والے بیٹے یا بیٹی) کے لیے حق جانشینی (یا قائم مقامی) تسلیم کیا گیا ہے۔ آخر مرنے والے خاوند' مرنے والی بیوی یا مرنے والے ماں اور باپ کا حصّہ کیوں نہ نکالا جائے اور پھر آگے ان کے ممکنہ وارثوں میں تقسیم کیا جائے؟ اس پر ہم مقالے کے حصّہ دوم کے باب دوم کی فصل دوم (صفحہ ۴۷ تا ۸۰) میں مفصل بات کر چکے ہیں۔ اسی سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کے قانونِ وراثت میں نیابت یا قائم مقامی نہیں چل سکتی۔

(۲) پھر اس میں دوسری خلافِ قرآن بات یہ ہے کہ مرنے والے بیٹے یا بیٹی (بیٹوں بیٹیوں) کا حصّہ نکال کر آگے ان کے قرآنی شرعی وارثوں کی بجائے صرف ان کے بیٹوں بیٹیوں ہی میں تقسیم کیا گیا ہے۔ آخر مرنے والی بیوی کے خاوند یا مرنے والے خاوند کی بیوہ کو آپ قرآن کے کس حکم کے تحت وراثت سے محروم کر سکتے ہیں؟ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ؟

○ یہاں ایک اور بات ضمناً سامنے آتی ہے۔ عائلی قوانین کی اس دفعہ نمبر ۴ میں اگرچہ صریحاً یہ نہیں کہا گیا کہ مرنے والے/والی کی بیوہ/خاوند کو محروم الارث کر دیا جائے گا۔ تاہم قانون سازی میں اولاد (بیٹا یا بیٹی) کے الفاظ کا

لازمی نتیجہ یہی نکلا کہ جب اعلیٰ عدالتوں میں اس قانون کی عملی تعبیر وتشریح کا وقت آیا تو یہ معاملہ صاف ہوگیا کہ ''مورث کی وفات سے قبل فوت ہوجانے والے پسران اور دختران کی اولاد کو اپنے باپ یا ماں کا حصّہ بحصّہ رسدی ملتا ہے۔ ایسے فوت شدہ پسران یا دختران کی بیوہ یا شوہر کو اس حصے سے کچھ نہیں ملے گا۔ (۴)

غالباً کسی مرنے والے کی بیوہ (یا مرنے والی کے شوہر) نے اس بناء پر اپنا شرعی حق مانگا ہوگا کہ آخر جس کا حصّہ تقسیم کے لیے نکالا جارہا ہے اسی میں اس کا بھی حصّہ بنتا ہے' مگر عدالت مجبور تھی کہ قانون کے الفاظ (Litra Legis) ان کے حق کو تسلیم نہیں کرتے' بلکہ یہ صرف ان کے نسبی وارثوں یعنی اولاد تک ہی محدود ہیں۔ عدالتوں کے ان فیصلوں میں ان لوگوں کے لیے بھی جواب موجود ہے جو یتیم پوتے کے محجوب الارث ہونے پر قرآن کے کسی صریح حکم (نص) کا مطالبہ کرتے ہیں۔ بعض قانونی احکام کے لیے نص صریح نہیں ہوتی مگر وہ نص صریح پر عمل کرنے یا اس کو نافذ کرنے کا صریح اقتضاء (corollary) ہوتے ہیں۔

○ قرآنِ حکیم کے احکامِ وراثت کی ان دو بغاوت کی حدوں کو چھونے والی خلاف ورزیوں کے باوجود مجتہد دین کا ان عائلی قوانین کی مدح سرائی کرنا اور یہ دعویٰ کرنا کہ ''اس قانون کی ایک شق بھی قرآن کے خلاف نہیں ہے'' (دیکھئے طلوعِ اسلام' اکتوبر ۱۹۶۱ء' صفحہ ۸۰) اس کی کیا توجیہہ کی جاسکتی ہے؟

کیا یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی صریح نافرمانی اور اللہ کی حدود سے تجاوز اور سرکشی نہیں؟ جس پر سورۃ النساء کی آیاتِ میراث کے معاً بعد سخت وعید سنائی گئی ہے۔ (دیکھئے سورۃ النساء: ۱۴)

○ اور آخر پر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ عائلی قوانین کی دفعہ نمبر ۴ کے ذریعے کی گئی اس قانون سازی نے ملک کے کتنے یتامیٰ کا مسئلہ (یا مسائل) حل کر دیے ہیں۔ اس طرح دادا کی وراثت سے حصّہ لینے والے یتیم تو شاید پورے ملک میں ایک سو فی لاکھ بھی بمشکل ہوں گے۔

کیا باقی یتامیٰ کے بارے میں قرآن کریم خاموش ہے؟ (مناسب ہوگا کہ ہمارے مقالہ کے حصّہ دوم کے باب دوم ''قرآن اور تحفظِ مصالحِ یتامیٰ'' پر ایک نظر ڈال لیں) کاش کہ پاکستان میں حکومتی سطح پر ملک بھر کے یتامیٰ کے مسائل کے لیے قرآنی احکام کے مطابق قانونِ وصیت اور قانونِ نفقات (کفالت) کے نفاذ کے ذریعے قانون سازی کی جاتی' جس میں ہر طرح کے یتیموں کے علاوہ دوسرے محتاج مگر غیر وارث رشتہ داروں (بیوہ بہنوں' مفلس بھائیوں وغیرہ) اور غیر رشتہ داروں کے مسائل کے حل کی بھی گنجائش موجود ہے۔

○ اور حکومتی سطح پر اس مسئلہ کا حل بذریعہ قانون سازی کرنے کے حوالے سے یہاں بطور تقابل یہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ یہی مسئلہ (محجوب الارث یتیم پوتے وغیرہ کا) حل کرنے کے لیے حکومت مصر نے بھی قانون سازی کی ہے اور حکومت پاکستان نے بھی۔

○ حکومتِ مصر نے اس کا علاج وصیۃ واجبۃ کا قانون نافذ کرکے کیا ہے (جس پر مقالہ کے حصّہ دوم کے باب چہارم میں بات ہوئی تھی)۔ چونکہ وہاں عام قانونِ وصیت بھی نافذ ہے اور دادا اپنی زندگی میں ایسے یتیم پوتوں نواسوں وغیرہ کے لیے وصیت کرسکتا ہے جو بعد میں قانوناً نافذ ہوگی' اس کے علاوہ اپنی زندگی میں بطورِ ہبہ بھی دے

سکتا ہے‘ اس لیے مصری قانون (وصیت واجبہ) صرف ایسے محجوب الارث پوتوں نواسوں وغیرہ (اولاد الاولاد) کے لیے ہے جن کو دادا/نانا نے اپنی زندگی میں نہ تو کوئی چیز بطورِ ہبہ دی ہو اور وصیت بھی نہ کر سکا ہو‘ جس کی وجہ سے وہ عام قانونِ وصیت سے متمتع نہ ہو سکتے ہوں (جیسے امریکی قانون میں وہ بیوی جس کے لیے خاوند کو وصیت کا موقع نہ ملا) ایسے پوتوں پوتیوں نواسوں نواسیوں کے لیے مورث کے کل ترکہ کے ایک تہائی حصّہ میں سے (جو سُنّت کے مطابق وصیت کی حد ہے) بذریعہ سول عدالت بطور وصیت واجبہ حصّہ ملنے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ مصری حکومت کا یہ قانون قرآن وسُنّت سے قریب تر ہے‘ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ وہاں الازہر (یونیورسٹی) اور علماء دین کے اثرات غالب ہیں‘ ورنہ متجدّدین مصر میں بھی تھوڑے اور کچھ کم فعال نہیں۔ وہاں تو ایسے لوگ بھی تھے جو کمال پاشا کی طرح عربی زبان کے لیے لاطینی رسم الخط اختیار کرنے کے زبردست حامی تھے۔ لیکن وہاں کے متجدّدین (بلکہ خواندہ عوام) بھی عربی زبان سے اتنے جاہل نہ تھے کہ وہ قرآن کی آیاتِ میراث میں بیان کردہ چھ بنیادی وارثوں کے مفہوم سے بھی بے خبر ہوں۔ ان کے لیے قرآنی قانون وراثت میں صرف نسبی وارثوں کا تصوّر سراسر اجنبی تھا‘ جو سراسر غیر اسلامی تصوّر ہے۔

○ اس کے برعکس پاکستان میں چونکہ محجوب الارث کو مورث کی وصیت سے متمتّع ہونے کا بذریعہ قانون موقع ہی نہیں دیا گیا (یعنی یہاں قرآنی قانونِ وصیت نافذ نہیں) اس لیے یہاں اس مقصد (محجوب الارث کو کچھ دلانے) کے لیے قرآن کے قانونِ وراثت میں ہی تحریف کر دی گئی۔ یہاں ایسے تمام اولاد الاولاد کو جو بوقت تقسیم وراثت زندہ موجود ہوں (چاہے دادا/نانا ان کو اپنی زندگی میں بھی کچھ دے گیا ہو) سب کے لیے ''وراثت'' پا سکنے کے لیے قانون سازی کی گئی ہے۔ (مصری قانون میں یہ شرط مذکور ہے جبکہ ہمارا قانون بالکل خاموش ہے) اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ پاکستان میں عربی بلکہ قرآن کے ترجمہ تک سے ناآشنا عوام اور ان عوام کے جذبات کا استحصال کرنے والے متجددین‘ دیگر عوامل کے علاوہ ـــــ سب ہی شعوری یا غیر شعوری طور پر ہندوانہ رواجی قانونِ وراثت سے متأثر اور مانوس تھے (کہ یہ قانون یہاں قریباً سو سال تک رائج رہا) اور یہ نظریہ قائم مقامی کے لیے بھی بہت موزوں ہے۔ لہٰذا یہاں حکومت کی قانون سازی اس دائرے سے باہر نہ نکل سکی۔ چنانچہ یہاں کے متجددین نے (جو مصری متجددین کے مقابلے پر علم دین میں بھی فروتر ہیں) کچھ تو علمائے دین کے مقابلے پر مخالفانہ ضد کی وجہ سے اور کچھ قرآنی قانونِ وراثت سے بے خبری کی بناء پر ـــــ اس مسئلے کے ایسے حل (قانون) پر صاد کر دیا جو ہندوانہ رواجی قانون سے متاثر اور مانوس عوام کو پسند اور مطلوب تھا۔ اور عوام کی اس ''پسند'' اور طلب پر گواہ ہیں پنجاب مقنّنہ کی طبع کردہ مجموعہ ''آراء'' میں وہ متعدد عوامی آراء جن کی طرف ہم مقالہ میں کئی جگہ حوالے دے آئے ہیں۔

○ یہی وجہ ہے کہ اس مسئلہ کے بارے میں حکومت مصر کا قانونی حل نسبتاً قرآن وسُنّت سے قریب تر اور اسلامی ہے‘ جب کہ حکومت پاکستان کا حل (قانون) قرآن سے بیگانہ‘ ہندو رواجی قانون سے قریب تر اور محض ''عوامی'' ہے۔

حواشی اور حوالہ جات

(۱) اس قسم کے مغالطہ کی نہایت عمدہ مثال عبدالعزیز الکنانی کا عباسی خلیفہ المامون کے دربار میں معتزلی وزیر کے ساتھ وہ مناظرہ ہے جس کا قصہ خود انہوں نے ایک رسالہ کی شکل میں لکھا ہے۔ اس کا نہایت عمدہ اردو ترجمہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے ''تاریخ عہد عباسیہ کا ایک ورق'' کے عنوان سے کیا تھا۔ یہ مضمون مولانا آزاد کے ایک مجموعہ مضامین بعنوان ''صدائے رفعت'' کے صفحہ ۱۴ تا صفحہ ۸۷ پر ہے۔ یہ کتاب ملک پبلشرز لائل پور (حال فیصل آباد) نے شائع کی تھی۔

(۲) مثلاً دیکھئے روزنامہ جنگ لاہور کی اشاعت ۲۸ فروری تا ۷ مارچ ۱۹۸۶ء (جمعہ میگزین) میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا مضمون اور ''طلوعِ اسلام'' اپریل ۱۹۸۶ء میں اس پر غیظ وغضب کا اظہار اور اپنے پرانے خود ترک کردہ موقف کی تکرار۔

(۳) اگرچہ بعد میں جب پنجاب مقننہ کی اس مسئلہ پر پبلک آراء (فروری ۱۹۵۴ء) شائع ہوئیں تو پتہ چلا کہ متعدد وکلاء اور ججوں نے بھی اس نظریہ کی نامعقولیت واضح کردی ہے۔ لیکن یہاں مقالہ نگار بطور اظہار ممنونیت اس بات کو ریکارڈ پر لانا چاہتا ہے کہ تیاری برائے مقالہ کے ابتدائی دنوں میں جب میں نے جیراجپوری صاحب کا مقالہ ''محجوب الارث'' پڑھا تو میں ان کے استدلال سے بڑا متاثر ہوا اور ان کے اس نئے نظریہ اقربیت اور یتیم بھتیجے کو چچا کا بھائی بنا کر وراثت دینے کو نہایت معقول حل سمجھنے لگا تھا۔ ۱۹۵۳ء کی تعطیلاتِ گرما میں اپنے گاؤں (حبیب ضلع جھنگ) گیا تو وہاں مولانا محمد حسنؒ خطیب جامع مسجد جھنگ شہر سے اس مسئلہ پر تبادلہ خیالات کے لیے ملاقات کی اور ان کے سامنے جیراجپوری صاحب کے نظریۂ اقربیت کی بات ہوئی تو مولانا نے فرمایا کہ ''حافظ صاحب ذرا متعدد بھتیجوں کے ساتھ صورت حال پر غور کیجیے''۔ مجھ پر اس نظریہ کی لغویت اسی وقت واضح ہوگئی۔ اس مسئلہ میں میرے پہلے رہنما مولانا محمد حسن صاحب مرحوم ومغفور ہی تھے۔

(۴) دیکھئے P.L.D 1975 پشاور 71 نیز P.L.D 1978 لاہور 483۔

مراجع ومصادر

(۱) قرآن حکیم

(۲) احکام القرآن لابی بکر محمد بن عبداللہ ابن العربی الاندلسی م ۵۴۲ھ، مطبعۃ السعادۃ مصر ۱۳۳۱ھ

(۳) احکام القرآن لابی بکر احمد بن علی الرازی الجصاص م ۳۷۰ھ، مطبعۃ اوقاف اسلامیہ قسطنطنیہ ۱۳۳۵ھ (بعہد سلطان وحید خان وباہتمام نظارۃ الاوقاف)

(۴) فتح القدیر۔ الجامع بین فنی الروایۃ والدرایۃ من علم التفسیر للامام محمد بن علی الشوکانی م ۱۲۵۰ھ ——— مطبعۃ مصطفی البابی (مصر) ۱۳۴۹ھ

(۵) تفسیر المنار للسید محمد رشید رضا۔ مطبعۃ المنار، مصر، الطبعۃ الثانیۃ ۱۳۶۵ھ

(۶) تفسیر المراغی لاحمد مصطفی المراغی، مطبعۃ مصطفی البابی الحلبی و اولادہ بمصر --- الطبعۃ الاولی ۱۳۶۵ھ/۱۹۶۴ء

(۷) تفسیر ابن کثیر --- حافظ ابن کثیر

(۸) تفسیر احمدی، از ملا جیون، مطبوعہ مطبع حسنی (مقام وتاریخ طباعت ندارد)۔

(۹) تفسیر ابوالفتوح رازی، از شیخ حسین بن علی الخزاعی المعروف بابی الفتوح رازی، مطبوعہ چاپ خانہ شرکت تضامنی محمد حسن علمی وشرکاؤہ۔ تہران (ایران) خرداد ماہ ۱۳۲۰ھ۔

(۱۰) تفسیر بیان القرآن اردو، مولانا اشرف علی صاحب تھانوی، مطبوعہ اشرف المطابع تھانہ بھون (انڈیا) سنہ ندارد۔

(۱۱) تفسیر حقانی (فتح المنان) اردو تفسیر از مولانا عبدالحق دہلوی، شائع کردہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۳۶۴ھ۔
(۱۲) صحیح البخاری لابی عبد اللہ محمد بن اسماعیل البخاری م ۲۵۶ھ، مطبوعہ لیدن، مطبعۃ بزیل ۱۹۰۸ء
(۱۳) صحیح مسلم لابی الحسنین مسلم بن حجاج نیشاپوری م ۲۶۱ھ، ناشر محمد صبیح و اولادہ، بمیدان الازہر بمصر ۱۳۳۴ھ۔
(۱۴) صحیح الترمذی لابی عیسی محمد بن عیسی الترمذی م ۲۷۹ھ، المطبعۃ المصریۃ بمصر ۱۳۵۰ھ موافق ۱۹۳۱ء۔ الطبعۃ الاولی۔
(۱۵) موطا، الامام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ م ۱۷۹ھ، داراحیاء الکتب العربیۃ، عیسی البابی الحلبی و شرکاؤہ (مصر) ۱۳۷۰ھ/۱۹۵۱ء
(۱۶) بلوغ المرام للحافظ ابن حجر العسقلانی م ۸۵۲ھ، مطبع مصطفی محمد صاحب المکتبۃ التجاریۃ الکبری مصر، سنۃ طباعت ندارد۔
(۱۷) الجامع الصغیر للسیوطی۔ مصطفی البابی الحلبی و اولادہ بمصر۔ سنۃ ندارد۔
(۱۸) الفروع من الجامع الکافی لملا محمد بن یعقوب بن اسحاق الکلینی م ۳۲۹ھ، مطبعۃ نولکشور لکھنؤ ۱۸۸۶ء
(۱۹) کتاب الأم، الامام محمد بن ادریس الشافعی رحمۃ اللہ علیہ المطبعۃ الکبری الامیریۃ۔ بولاق (مصر ۱۳۲۵ھ)
(۲۰) المحلی لابی محمد بن احمد بن سعید بن حزم الاندلسی م ۴۵۶ھ مطبوعۃ ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ قاہرۃ ۱۳۵۲ھ۔
(۲۱) بدایۃ المجتہد لابن رشد القرطبی م ۵۹۵ھ، مطبعۃ الاستقامۃ قاہرۃ ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء
(۲۲) فیض الباری، شرح بخاری للعلامہ محمد انور شاہ کشمیری م ۱۳۵۲ھ، مطبعۃ دارالمامون مصر ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء، الطبعۃ الاولی۔
(۲۳) عینی شرح بخاری۔
(۲۴) مصادر الاحکام الشرعیۃ، صالح بن غالب الیافعی سلطان حضر موت .....مطبع مصطفی البابی الحلبی بمصر۔ ۱۳۶۵ھ/۱۹۵۰ء، الطبعۃ الاولی۔
(۲۵) الاحکام فی اصول الاحکام لابن حزم الاندلسی م ۴۵۶ھ مکتبۃ الخانجی مصر ۱۳۴۵ھ
(۲۶) اصول التشریع الاسلامی للاستاذ علی حسب اللہ۔ مطبعۃ العلوم شارع الخلیج بمصر، الطبعۃ الاولی ۱۹۵۲ء
(۲۷) تاریخ فقہ اسلامی، علامہ خضری کی تاریخ التشریح الاسلامی کا اردو ترجمہ از عبدالسلام ندوی۔ شائع کردہ دارالمصنفین اعظم گڑھ (انڈیا) سنہ ندارد۔
(۲۸) مجموعۃ فتاوی ابن تیمیۃ رحمۃ اللہ علیہ لابن تیمیۃ الحرانی م ۶۲۱ھ، مطبع کردستان العلمیۃ قاہرہ، مصر ۱۳۲۹ھ۔
(۲۹) الدر المختار لعلاء الدین علی الحصکفی۔ مطبع مجتبائی دہلی ۱۹۱۶ء
(۳۰) المقارنات التشریعیۃ بین القوانین الوضعیۃ المدنیۃ والتشریع الاسلامی للسید عبداللہ علی حسین۔ داراحیاء الکتب العربیۃ، عیسی البابی الحلبی مصر، الطبعۃ الاولی ۱۳۶۸ھ/۱۹۴۹ء۔
(۳۱) المواریث الاسلامیۃ فی المذاہب الاربعۃ لاحمد کامل الخضری، شیخ معہد دمیاط، الطبعۃ الثانیۃ۔ مطبعۃ التوکل بمصر ۱۳۶۹ھ/۱۹۵۰ء
(۳۲) احکام المواریث لمحمد محی الدین عبدالحمید، مطبع عیسی البابی، مصر ۱۹۴۷ء
(۳۳) سراجی مع ضیاء السراج (حاشیہ)۔ مطبع نظامی کانپور ۱۲۹۵ھ، مصنف سراج الدین محمد بن محمد سجاوندی م ۶۵۰ھ ہیں۔
(۳۴) شریفیہ شرح سراجیہ، از سید شریف علی، مطبع گلشن احمدی لکھنؤ ۱۳۸۹ھ/۱۸۷۲ء۔
(۳۵) کتاب الفرائض من شرائع الاسلام، للشیخ نجم الدین ابی القاسم المحلی، مطبوعہ وکٹوریہ پریس لاہور ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء۔
(۳۶) الوراثۃ فی الاسلام للحافظ اسلم الجیراجی، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۲۲ء

(۳۷) حل المشکلات فی الفرائض' شجاع بن نور اللہ انقروی' مدرس مدرسہ سرای عتیق ادرنہ (ترکی) مطبوعہ بولاق ۱۲۸۵ھ۔
(۳۸) فتاویٰ عالمگیری۔ اردو ترجمہ از سید امیر علی مرحوم' مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ۱۹۴۸ء۔
(۳۹) حجۃ اللہ البالغہ۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ دہلوی م ۱۱۷۶ھ کی کتاب کا اردو ترجمہ از مولانا عبدالرحیم صاحب پشاوری۔ شائع کردہ قومی کتب خانہ لاہور۔ سنہ طباعت ندارد۔
(۴۰) جامع الاحکام فی فقہ الاسلام۔ سید امیر علی مرحوم کی انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ از سید ابوالحسن صاحب۔ مطبوعہ نولکشور لکھنؤ (سن طباعت ندارد)۔
(۴۱) مختار المسائل۔ اردو ترجمہ از سید سرور حسین صاحب' مطبوعہ نامی پریس لکھنو ۱۹۳۱ء۔
(۴۲) فتاویٰ المیراث۔ معروف بہ شرح نظم فرائض۔ اصل از مولوی جعفر علی و شرح از مولوی محمد یوسف علی۔ مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ۱۲۹۰ھ/ ۱۸۷۳ء
(۴۳) الوراثت فی القرآن۔ خواجہ احمد الدین امرتسری۔ شائع کردہ دفتر امت مسلمہ امرتسر ۱۹۴۱ء
(۴۴) تین اہم مسائل' شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام کراچی۔ سنہ ندارد
(۴۵) سیرت عائشہ ؓ' از سید سلیمان ندوی' دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ سنہ ندارد
(۴۶) الفاروق۔ مولانا شبلی نعمانی' مطبوعہ مطبعہ معارف اعظم گڑھ۔ سنہ ندارد
(۴۷) اسلام کا اقتصادی نظام' از حفظ الرحمٰن سیوہاروی۔ دارالمصنفین دہلی۔ سنہ ندارد
(۴۸) پوتے کی میراث۔ مفتی محمد شفیع صاحب کا مختصر سا پمفلٹ (تحریر) شائع کردہ جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد لاہور (۱۹۵۴ء)
(۴۹) یتیم پوتے کا حق وراثت۔ سید غلام احمد بی اے پلیڈر منٹگمری کا مختصر سا پمفلٹ جسے خود مصنف نے شائع کیا ہے۔ ۱۹۵۳ء
(۵۰) مقننہ پنجاب (Legislative Assembly) کی اس مسئلہ پر طبع کردہ پبلک آراء یعنی
Opinions on the Punjab Muslim Personal Law (Shariat) Application (Amendment) bill (8th of 1953) and its supplement.

English Books

51. *Encyclopedea of Religions and Ethics (Edited by James Hastings (Vol: 7 Article on "Inheritance"*
52. *Principles of Mohammaden Law by F.D. Mulla, 13th, Ed (1950) Calcatta.*
53. *Mohammaden Law by F.B Tayabji, 3rd Ed (1940) Bombay.*
54. *Muslim Institutions by Maurice Gaudferoy, 1st Ed (1950) George Allen and Unwin, London.*
55. *Reconstruction of Religious Thought in Islam by Allama Iqbal (Lahore Edition).*
56. *Hand Book of Mohammaden Law by Syed Amir Ali, 3rd Ed. (1911), Calcatta.*

اس کے علاوہ رسالہ طلوعِ اسلام کراچی کے ۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۴ء کے متعدد پرچوں' رسالہ ترجمان القرآن لاہور کے ۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۴ء کے مختلف شماروں اور اخبار اہل حدیث امرتسر کے ۱۹۱۷ء اور ۱۹۱۸ء کے پرچوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

MESSAGE OF THE QUR'AN

Translation and Brief Elucidation

By

Dr. Israr Ahmad

Surah Al-An'am

(The Cattle)

(Recap of verses 111 – 129 of Surah Al-An'am and fresh exposition of verses 130 – 144 of the same Surah, inclusive)

Translator's note:

For the sake of continuity and coherent explanation, most of the general discourse has been made by employing the 'male' as a prototype, which is in no way meant to be diminutive of the opposite gender or to disrespect the status of women.

Moreover, each verse (Ayah) has been kept as a continuum in order to prevent the misrepresentation of meanings, which may occur when the verses are broken up and the translation of those verses becomes kaput when done in bits and pieces.

Cross-references taken from other parts of the Qur'an and the Hadith of the Messenger of Allah (SAAW) are provided in italics.

The Translation of the Holy Qur'an done by the Message International – USA (www.FreeQuran.com) and edited by Saheeh International – UK, Dar Al Mountada – Saudi Arabia and Al Qummah – Egypt has been used in order to synchronize the use of modern English Language, which we believe will give a more accomplished sense of understanding to Today's mind.

Recap of verses 111 – 129 (inclusive) of Surah 6, Al-An'am

This section of Surah 6, Al-An'am (verses 111 – 129) elucidates that the denial of the disbelievers is not based on any 'misunderstanding' or 'ignorance', rather, this disease is due to their stubbornness and arrogance which cannot be cured by showing 'miracles'. Therefore, even if they were shown signs like angels sent to them or the dead talking to them, they would still not believe, unless Allah *(SWT)* wanted otherwise. Such a course, however, goes against the Grand Scheme of Allah *(SWT)*, which underlies the creation of man. Hence it is futile to expect Allah *(SWT)* to intervene in the matter and to force those people to believe by the exercise of His *(SWT)* Will by force. The Holy Prophet *(SAAW)* has been comforted in this section of the Surah that the hostility and defiance of his *(SAAW)* enemies is nothing surprising, for Allah *(SWT)*, in His *(SWT)* infinite wisdom, also made enemies for the previous Prophets *(AS)*, who opposed them *(AS)* and rebelled against them *(AS)*, therefore, he *(SAAW)* ought not to be distraught by this fact. Then Allah *(SWT)* declares that if He *(SWT)* had willed, the devils among mankind and the Jinn would not have had any authority to plot against His *(SWT)* Messengers *(AS)*, but it is from His *(SWT)* decree and Perfect Wisdom that every Prophet *(AS)* had enemies. Furthermore, we should always bear in mind that, according to the Qur'an, there is a tremendous difference between 'Allah's *(SWT)* Will' and 'Allah's *(SWT)* good pleasure'. In short, all 'events' require the Will of Allah *(SWT)*, of which certain 'events' do not please Him *(SWT)*, whereas certain 'events' do. The verses in this section of the Surah also elaborate and qualify that this is done in order to distinguish the righteous believers from those who lack zeal. Another reason for this process of polarization is so that the hearts of those who do not believe in life after death will be inclined towards the lies and fabrications of these devils that they listen to and are overcome by their deceit. Therefore, the Holy Prophet *(SAAW)* is commanded to let them take the devious ride and see what they gain from it, for the end of evil must be a tormenting punishment. Allah *(SWT)* then commands His *(SWT)* Prophet *(SAAW)* to shun the disbelievers by asking them rhetorically that should he *(SAAW)* look for any other judge than Allah *(SWT)* even after His *(SWT)* decision to

reveal this miraculous Qur'an to him *(SAAW)*, which elucidates and decrees in clear terms the right path for all mankind to come.

This section of the Surah also refers to the Jews and the Christians who knew from the knowledge of their Scriptures that Prophet Muhammad *(SAAW)* is the Last Messenger *(SAAW)* of Allah *(SWT)* and that the message he *(SAAW)* brought is the Truth, yet they concealed the Truth from people because of their jealousy and arrogance. Though this verse is addressed to the Holy Prophet *(SAAW)* in terms of words, in reality, the purpose was to convey the message to the others. As for the Holy Prophet *(SAAW)*, he *(SAAW)* could never be one *(SAAW)* of those in doubt.

The Holy Qur'an has been identified as the zenith of Truth and Justice i.e. all events, conditions, promises, and warnings mentioned in it are true and correct. Secondly, none can change Allah's *(SWT)* Word, for His *(SWT)* Word is pristinely pure and far beyond any such possibilities. He *(SWT)* hears and knows everything that His *(SWT)* servants are doing. It is also indicated that the majority of the people living on earth are in error. This is because at most times the misguided majority overwhelms an individual and he ends up following it. But Allah *(SWT)* has commanded Muslims [by addressing the Prophet *(SAAW)*] not to be impressed by the majority, as they are people who have gone astray. Thus the verse commands Muslims [by addressing the Prophet *(SAAW)*] not to follow those who have gone astray, as they will lead the believers away from the straight path, too. It is also pointed out that 'majority' is not a criterion for truth and guidance, thus falsifying the notion of popular sovereignty as it currently is embedded in the so-called 'modern democratic nations'. On the other hand, it is the belief of a Muslim that sovereignty belongs only to Allah *(SWT)* and none has the authority to abandon the law decreed by Allah *(SWT)*, even if it is by a popular vote. It is declared that the disbelievers do not have any knowledge; therefore, they follow only their opinions and preach only falsehood.

In this section, Allah *(SWT)* also directs the Muslims by showing them the difference between carrion and an animal slaughtered properly.

Thus commanding them to eat only that animal (provided that it is a creature that is Halal/Permitted and not Haram/Prohibited as food) on which Allah's *(SWT)* name is invoked i.e. while slaughtering it. When seen from a broader perspective we find that on the one hand, many nations have imposed on themselves superfluous religious taboos, which include a variety of dietary restrictions, while on the other hand, they have declared lawful many of the things which Allah *(SWT)* has forbidden. Some people have even gone so far as to consider eating animals slaughtered in the name of Allah *(SWT)* as unlawful, while those slaughtered with no mention of Allah's *(SWT)* name may be eaten. Allah *(SWT)* repudiates this and urges the Muslims – if they believe in Him *(SWT)* and obey His *(SWT)* injunctions – to smash the superstitious and prejudiced notions contrived by human beings in disregard of Allah's *(SWT)* revealed guidance, and to recognize as unlawful all that Allah *(SWT)* has declared to be unlawful, and as lawful all that Allah *(SWT)* has declared to be lawful. This section of the Surah also tells the Muslims to obey the commandments of Allah *(SWT)* and stick to the code revealed by Him *(SWT)*, as He *(SWT)* has manifestly told what is permitted to eat and what is forbidden. Therefore, Muslims are required to abide by these prescribed laws and eat only that on which Allah's *(SWT)* name has been invoked and have no doubt about anything which He *(SWT)* has permitted. The exception mentioned, is that in the case of extreme helplessness, for in this case it is allowed to eat whatever is available, with neither having a desire for it nor taking more than needed for survival. Allah also *(SWT)* commands His *(SWT)* servants to abstain from all kinds of sins whether committed openly or in secret. However, even after knowing Allah's *(SWT)* Will, those who persist in sins will surely be punished for their evil deeds in the Hereafter by the torment of the Hellfire.

This section of the Surah clearly guides that we can say that alive is the one who puts his faith in Allah *(SWT)* and His *(SWT)* Messenger *(SAAW)* and follows the Divine revelation. On the other hand, we are told that, in terms of fulfilling the purpose of life, the person who does not follow the Divine revelation deserves to be called dead. This verse also states that Allah *(SWT)* gives light to those who are alive

(believers) and darkness to those who are dead (disbelievers). The light mentioned here is the Qur'an and darkness is Kufr (disbelief). Whoever Allah *(SWT)* gives light he can see things, both at far distance and near, and he carries this light with him wherever he moves about among the people. But the one who does not have access to this light remains in the darkness of ignorance and deviation. He has no idea as to what lies ahead in the eternal life, nor can he comprehend how beneficial or harmful it can be. This section of Surah Al-An'am also labels those who opposed and defied Allah's *(SWT)* Messengers *(AS)* as the 'chiefs and leaders of the criminals'. This reference draws a connection with the chiefs of the Quraysh, who similarly, called others to disbelief, hindered them from the path of Allah *(SWT)*, and showed hostility against Prophet Muhammad *(SAAW)*. Allah *(SWT)* declares at the end of the verse that the curse of what these criminals do against His *(SWT)* servants and Messenger *(SAAW)* recoils back on them though they do not perceive it. It specifies that the station of Prophet-hood or Messenger-ship cannot be acquired through intellectual perfection, utmost striving, devotion, family nobility or wealth, nor is it controlled by human beings. Instead, it is nothing but divine grace from Allah *(SWT)*, which He *(SWT)* bestows on whomever He *(SWT)* Wills as He *(SWT)* knows best who is suitable for it. Furthermore, a stern warning is issued to those who oppose Allah's *(SWT)* Messengers *(AS)* and hinder others from following them *(AS)*. Therefore, Allah *(SWT)* says that a disgraceful punishment and humiliation awaits such criminals as a recompense of the evil schemes and plots they used to devise against the Prophets *(AS)*.

It is also elucidated in this section of the Surah that for whomever Allah *(SWT)* Wills, He *(SWT)* makes it easy for him to follow Islam and opens his heart to Tawhid (Oneness of Allah) and for the understanding and acceptance of the Truth. Thus he becomes more and more uninterested in the fleeting enjoyments and luxuries of this world while the Hereafter becomes the real object of his desires. Allah *(SWT)* then declares that whoever does not accept guidance then Allah *(SWT)* makes his heart narrow i.e. to accept the truth and act in accordance with it becomes very difficult for him, because of the

heaviness of faith on him. It is also declared that Allah *(SWT)* brings disgrace and humiliation to those who do not believe by making their hearts closed for guidance and the acceptance of the truth. The right path referred to is Islam, which is legislated by Allah *(SWT)* in His *(SWT)* Infinite Wisdom for His *(SWT)* servants to follow. It is declared that Allah *(SWT)* has elaborated on the Straight Path by revealing this Glorious Qur'an to His *(SWT)* Messenger *(SAAW)*. It also expounds that those who spend their lives righteously, according to the edicts of Allah *(SWT)* and His *(SWT)* Messenger *(SAAW)*, will enjoy 'the Abode of Peace', i.e., they will be admitted into Paradise as a reward for their faith and good deeds. In Paradise, they will be in absolute peace and protection of Allah *(SWT)* as they will be safe from every misfortune and evil. While referring to the Day of Judgement, it is elaborated that on that Day, Allah *(SWT)* will gather all the evil Jinns and their helpers and supporters from among mankind who used to invoke them for help and worshipped them. Then Allah *(SWT)* will reprimand the entire assembly (of evil Jinns) for misguiding humans from the Straight Path. This section of Surah Al-An'am (verses 111- 129) concludes by portraying a picture of the Day of Judgement and expounds that the wrongdoers amongst the Jinn and mankind will be grouped on the Day of Resurrection and they will be united in the Hellfire because of their mutual friendship in this world. Just as the wrong-doers had been accomplices in sin and evil during their earthly life, they would remain companions in the Hereafter as well to share its punishment.

==========

Expositionof verses130– 144 of Surah Al-An'am

Verse 130

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓى اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ۝

"O company of jinn and mankind, did there not come to you messengers from among you, relating to you My verses and warning you of the meeting of this Day of yours?" They will say, "We bear witness against ourselves"; and the worldly life had

deluded them, and they will bear witness against themselves that they were disbelievers".

The verse commences by expounding that on the Day of Resurrection Allah *(SWT)* will ask the disbelieving Jinns and humans as to why they disbelieved in His *(SWT)* verses sent to them through the Messengers *(AS)* from among them, who *(AS)* recited to them His *(SWT)* revelations and warned them of the Day of Reckoning? In reply, they will have nothing to answer.

They will confess that His *(SWT)* Messengers *(AS)* did come to them in succession to show them the path of guidance and salvation but they turned a deaf ear to them *(AS)* and remained involved in disbelief and wrongdoings, instead to respond to their *(AS)* call.

The verse then clarifies that the real reason for their disbelief was the charms and fleeting enjoyments of this worldly life, which made them follow the wrong path, and that eventually made them heedless to their tormenting end. They were deniers of and disbelievers in, rather than ignorant of the Truth. They would acknowledge that the Truth had been conveyed to them but they refused to accept that.

It must be noted that reference made in the verse regarding "Messengers from among you" does not mean that Jinns have Messengers *(AS)* of their own. Instead it is an agreed upon issue amongst the Islamic Jurists that the Messengers *(AS)* are from among the mankind only. Allah *(SWT)* has grouped the Jinns and human beings to receive His *(SWT)* Message. The Jinns like the human beings are at liberty to exercise their free will, but they are required to worship Allah *(SWT)* by accepting Islam. Otherwise, like humans, the disbelievers amongst the Jinns will also be subject to the Final Reckoning by Allah *(SWT)* on the Day of Judgment.

Verse 131

ذٰلِكَ اَنۡ لَّمۡ يَكُنۡ رَّبُّكَ مُهۡلِكَ الۡقُرٰى بِظُلۡمٍ وَّاَهۡلُهَا غٰفِلُوۡنَ ۝

"That is because your Lord would not destroy the cities for wrongdoing while their people were unaware".

This verse indicates that Allah's *(SWT)* punishment does not descend on any town or city for their disbelief and disobedience until and

unless He *(SWT)* warns them through His *(SWT)* Messengers *(AS)*. Allah *(SWT)* does not want His *(SWT)* creatures to have any valid reason to complain that He *(SWT)* had left them ignorant of the Right Path, and then convicted them of error. Allah *(SWT)* has forestalled any such grievance by sending Prophets *(AS)* and revealing Holy Books to warn both Jinns and human beings. If people continue to falter despite Allah's *(SWT)* arrangements for their guidance, they themselves are to be blamed for the punishment they will receive, for wrongdoings, and subsequent reprimand by Allah *(SWT)*.

Verse 132

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۭ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ۝

"And for all are degrees [i.e., positions resulting] from what they have done. And your Lord is not unaware of what they do."

This verse elucidates that with Allah *(SWT)*, there are ranks or degrees for classes of people amongst the humans and the Jinns and these ranks or degrees are assigned according to their deeds and good actions that they perform in this world. The verse concludes by declaring that indeed Allah *(SWT)* is aware of the deeds of His *(SWT)* servants.

Verse 133

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۭ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَاۗءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ۝

"And your Lord is the Free of need, the possessor of mercy. If He wills, He can do away with you and give succession after you to whomever He wills, just as He produced you from the descendants of another people."

This verse explains that Allah *(SWT)* does not send Messengers *(AS)* to the Jinns and the mankind because He *(SWT)* needs our worship or obedience. Instead, He *(SWT)* is free of all wants and is not in need of His *(SWT)* servants to obey Him *(SWT)* or worship Him *(SWT)*; rather it is we who stand in need of Him *(SWT)* in all situations, and He *(SWT)* is full of mercy for His *(SWT)* creation.

It must be noted that the Qur'anic statement: 'Free of need' signifies that even if all human beings became disobedient, Allah's *(SWT)* dominion will not shrink. Allah *(SWT)* is dependent neither upon their show of veneration nor upon their offerings. Allah *(SWT)* lavishes His *(SWT)* limitless treasures on human beings without the need of 'return'.

The other statement, namely: 'The possessor of mercy', highlights two facts as follows:

1. Allah *(SWT)* directs and commands the man to follow the Right Path for his own good. The behaviour contrary to it, the evil conduct harms human beings. He *(SWT)* is immune to the conduct of human beings. It is His *(SWT)* supreme mercy and benevolence that, He *(SWT)* desires to reward the man to the maximum for his good deeds.

2. Allah *(SWT)* is All Mercy. He *(SWT)* is not unduly stern. He *(SWT)* gets no pleasure in punishing His *(SWT)* creations. He *(SWT)* is not there to find faults. He *(SWT)* is compassionate towards His *(SWT)* creations. It is in the same Surah that we find:

"He has prescribed Mercy for Himself." (Al-An'am, 6:12)

Allah *(SWT)* is highly compassionate towards all of His *(SWT)* creatures and governs them with utmost mercy and benevolence, and the same characterizes His *(SWT)* dealings with human beings as well. Hence, He *(SWT)* constantly forgives the sins of people. Many disobey, indulge in sins, commit crimes, and disregard Allah's *(SWT)* commands, even then they are nourished by the sustenance provided by Him *(SWT)*. It is His *(SWT)* attribute of Al-Rehman that, Allah *(SWT)* shows His *(SWT)* mercy to all His *(SWT)* creations in the sense that He *(SWT)* created them and granted them abundant provisions. Allah *(SWT)* nevertheless, continually treats them with forbearance and forgives them. He *(SWT)* grants them respite so that they may take heed, understand things properly, and reform themselves. Had He *(SWT)* been excessively stern, He *(SWT)* could even have obliterated them instantly and replaced them with other people.

Today, through the advancements in archaeology we can see that, millions of human beings, who used to inhabit this earth, vanished

from the face of this earth and a different set of people took their place. The People of Aad and Thamud were destroyed by Allah *(SWT)* for their disbelief and disobedience and Allah *(SWT)* brought other people to replace them.

Verse 134

اِ مَا تُوۡعَدُ مَآتٍ ۙ وَّوۡنَ لَآ اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِيۡنَ ﴿۱۳۴﴾

"Indeed, what you are promised is coming, and you will not cause failure [to Allah]."

This verse states emphatically that the Day of Resurrection / Day of Judgement is surely to come and on that day the disbelievers will not be able to escape from Allah's *(SWT)* punishment. On the Day of Resurrection, human beings of every epoch will be raised anew and made to stand before Allah *(SWT)* for final judgement.

Verse 135

قُلۡ يٰقَوۡمِ اعۡمَلُوۡا عَلٰی مَكَانَتِكُمۡ اِنِّیۡ عَامِلٌ فَسَوۡفَ ۚ تَعۡلَمُوۡ مَنۡ نَ ۙ تَكُوۡ لَهٗنُ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ نَّهٗ اِ لَا يُفۡلِحُ
الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۱۳۵﴾

"Say, "O my people, work according to your position; [for] indeed, I am working. And you are going to know who will have succession in the home. Indeed, the wrongdoers will not succeed."

In this verse, Allah *(SWT)* commands the Holy Prophet *(SAAW)* to give the pagans of Makkah a stern warning and tell them that stay as you are and keep on doing what you are doing against Islam and the Muslims, for I *(SAAW)* will remain on the Path of Allah *(SWT)* and will keep on doing what Allah *(SWT)* reveals unto me *(SAAW)* to do and soon you will find out who will be blessed with salvation in the Hereafter and who will suffer the punishment. The verse states the decree of Allah *(SWT)* that the wrongdoers will never succeed.

It is noteworthy that the crux of this verse is that if people prefer to ignore the Prophet's *(SAAW)* admonition and do not recant their misconduct, they are at liberty to follow their chosen path, but they should let the Prophet *(SAAW)* follow his *(SAAW)*. The ultimate results of their conduct will, in due time, become evident to all – to the Prophet *(SAAW)* as well as to his opponents.

Verse 136

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ۗ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝

"And they [i.e., the polytheists] assign to Allah from that which He created of crops and livestock a share and say, "This is for Allah," by their claim, "and this is for our 'partners' [associated with Him]." But what is for their "partners" does not reach Allah, while what is for Allah – this reaches their "partners." Evil is that which they rule."

The background of this verse is that the idolaters of Makkah used to set aside a portion from the produce of their lands and their cattle for Allah *(SWT)* and a portion for their idols. In this verse, Allah *(SWT)* declares that everything is created by Him *(SWT)* alone and the produce of the lands, too, was bestowed by Him *(SWT)* alone, yet they had transgressed by making false idols to share in what was given by Him *(SWT)* alone. The belief of the pagans in Allah *(SWT)* was so flimsy that whenever they had a drop in their produce they would apply this shortfall against the share that they had 'assigned' for Allah *(SWT)* and kept 'giving' their idols in full. If something from the portion reserved for the idols went into the portion they had 'reserved' for Allah *(SWT)* by mistake they would take it out! On the other hand, if something from the portion they had 'fixed' for Allah *(SWT)* accidentally mixed with the portion of their idols, they would not take it out, for they would say that the 'idol is poor'.

The verse mentions that this action of the pagans of Makkah is a blatant transgression based on evil, for they do not realize that everything belongs to Allah *(SWT)* alone.

It must be noted that this is an elucidation of just one of the many acts of 'ignorance' which those people-insistently clung to, and which they were not prepared to forsake. They are also told about that major 'wrong' which, if not abandoned, will bar their way to salvation.

Moreover, the pagans and idolaters themselves acknowledged that the earth belongs to Allah *(SWT)*, and that it is He *(SWT)* Who *(SWT)* causes the vegetation to grow. They also affirmed that Allah *(SWT)* is the Creator of the animals which were yoked to their service. They believed, however, that the grace of Allah *(SWT)* for them was the outcome of the blessing and benediction of the angels, jinns, heavenly stars, spirits of their pious ancestors and so on, who cared for their well-being and were their patrons. They therefore used to make a two-fold division of their harvest and livestock offerings. One part was 'devoted' to Allah *(SWT)* in recognition of their gratitude to Him *(SWT)* for having granted them farms and animals, while the rest was devoted to the household gods of either their family or tribes in order to ensure their continuing grace and benediction.

In light of their false belief-system, Allah *(SWT)* censures them for this iniquity and asks them – since all those animals were created and had been granted to them by Allah *(SWT)* alone – what justification there is for making offerings to others. Is it not sheer ingratitude to ascribe the acts of benevolence and grace of the true Benefactor *(SWT)* to the intercession of others, and to associate them with Allah *(SWT)* in thanksgiving? Secondly, they are censured indirectly for assigning quite an arbitrary share in their 'offerings' to Allah *(SWT)*, as if they themselves were the law-maker who could ascribe shares to Allah *(SWT)* and others as they wished. To Allah *(SWT)* alone belong all the bounties He *(SWT)* has given man, and only His *(SWT)* Law should therefore determine what part of those bounties should be offered to Him *(SWT)* in thanksgiving and how the remaining should be spent. Hence even if they spend something in the way of Allah *(SWT)*, for the poor and the deprived, but according to their own will, that does not deserve to be accepted by Him *(SWT)*.

In a nutshell, there is also a subtle sarcasm in the verse at the trickery to which the polytheists resorted while 'dividing the offerings' between Allah *(SWT)* and the partners whom they had set up with Him *(SWT)*. By one device and another they increased the

share of the false deities, which only showed that their heart lay with those sham partners of Allah *(SWT)* rather than with Allah *(SWT)* alone.

Finally, in order to grasp what lay at the root of these superstitions, it is essential to know that the portion which these ignorant people earmarked for Allah *(SWT)* was 'intended to be devoted' to helping the indigent, the poor, travellers, orphans and so on. On the other hand, the portion earmarked for offerings to the partners' actually went either directly to the coffers of the priestly class or was offered at the shrines and thus ultimately reached the priests and caretakers of those shrines. Over the course of centuries these selfish religious leaders had impressed upon those simple-minded people that there was no harm in Allah's *(SWT)* 'share' being reduced, but that of Allah's *(SWT)* 'associates', far from being diminished, should be increased.

Verse 137

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ۝

"And likewise, to many of the polytheists their partners have made [to seem] pleasing the killing of their children in order to bring about their destruction and to cover them with confusion in their religion. And if Allah had willed, they would not have done so. So leave them and that which they invent."

This verse refers to one of the evil customs of the pagans (of Makkah) during the Age of Ignorance *(Jahiliyyah)*, i.e. killing their female children (infanticide). Allah *(SWT)* condemns such brutal acts of the pagans by declaring that Satan made it seem fair for them to kill their children, for fear of poverty and burying their daughters alive, for fear of dishonour. The devils (of mankind and jinns) had convinced the idolaters that the killing of their children was desirable; in order to destroy whatever of their morality was left.

The verse categorically elucidates that had Allah *(SWT)* willed He *(SWT)* could have stopped them from such monstrous actions, being

committed for ridiculous reasons, but He *(SWT)* does not force upon people in this world, as this life is only a test for His *(SWT)* creatures and He *(SWT)* has given man the freedom of choice and action.

It must be noted that the word 'partners' is now used in a different sense. In this verse the word 'partners' denotes those human beings and devils who had legitimized infanticide and even represented it as a commendable act.

The reason for calling such people 'partners' in this verse is that just as Allah *(SWT)* alone deserves to be worshipped, so He *(SWT)* alone has the right to make laws for His *(SWT)* creatures and to determine the limits of what is lawful and what is unlawful. Also, just as consecrating acts of devotion to anyone other than Allah *(SWT)* amounts to setting up partners with Him *(SWT)*, so to follow man-made laws in the belief that human beings have the right to be their own law-makers amounts to acknowledging others as partners of Allah *(SWT)*. Both these acts mentioned before amount to setting up partners with Him *(SWT)*, irrespective of whether or not man applies the word 'God' to those before whom he makes ritual offerings, or to those whose laws he considers to be essentially right and binding for men.

The use of the word 'ruin' in this verse is significant. It denotes, in the first place, the moral ruination of a people. A man whose callousness and cruelty reach the point where he begins to kill his offspring with his own hands not only becomes bereft of the essence of humanity, but has sunk even lower than the animals. Moreover, this signifies the ruin of a people and of the human race. This is because infanticide necessarily leads to loss of population which is detrimental to the interests of mankind and also of each nation, since it prevents those who could have carried the legacy of a nation from either being born or puts an end to their lives after, they are born. This rule also signifies the ultimate ruin, i.e. in the Hereafter. For indeed anyone who treats innocent children with such high-handedness, who cold-bloodedly slaughters the essence of his humanity, who acts so sordidly towards the human species as such, and even towards his own people, deserves severe punishment from Allah *(SWT)*.

Verse 138

قَالُوْا هٰذِهٖٓ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ ۖ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ ۭ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝

"And they say, "These animals and crops are forbidden; no one may eat from them except whom we will," by their claim. And there are those [camels] whose backs are forbidden [by them] and those upon which the name of Allah is not mentioned– [all of this] an invention of untruth about Him. He will punish them for what they were inventing."

This verse alludes to another of the ritualized and erroneous customs of the pagan Arabs. The pagan Arabs would release some animals as well as endow some tillage in the name of the idols and say that they were doing it for the pleasure of Allah *(SWT)* and only those were allowed to eat of them whom they chose themselves. They also dedicated some animals to their idols, with the prohibition of riding them or to carry loads. In this verse, Allah *(SWT)* not only judges such practices to be polytheistic, but also censures them as man-made innovations. Allah *(SWT)* is the master of all that they had consecrated as offerings to the deities. He *(SWT)* had neither encumbered human beings with the need to make any of those offerings and consecrations nor imposed those restrictions on what they might consume. These were the wilful inventions of headstrong and rebellious people who attributed to themselves the authority to make laws as they pleased.

Moreover, they had some other animals on which they would never pronounce the name of Allah *(SWT)* at any time, either when milking them, riding them or slaughtering them. Even though those rules had not been laid down by Allah *(SWT)*, people followed them under the false impression that they had been prescribed by Him *(SWT)*. They could not adduce any injunction from Allah *(SWT)* in support of such a belief, and all that they could claim was that it was an integral part of their ancestors' way of life.

Allah *(SWT)* declares in this verse that all these so-called customs and rituals are all lies and fabrications and He *(SWT)* will surely punish such a people in the Hereafter for what they used to invent against Him *(SWT)*.

Verse 139

قَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓى اَزْوَاجِنَا ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ ۭ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ ۭ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝

"And they say, "What is in the bellies of these animals is exclusively for our males and forbidden to our females. But if it is [born] dead, then all of them have shares therein." He will punish them for their description. Indeed, He is Wise and Knowing."

Another of the ignorant practice of the Pagan Arabs was that when a sheep consecrated as offerings to the deities would give birth to a male sheep (A 'Buck' or 'ram lamb'), they would slaughter it and give its meat to their males and not to their females. However, if it was born dead then they would share it men and women alike. Allah (SWT) admonishes them in this verse for this fabricated custom and warns them that He *(SWT)* will punish them for their attribution of such superstitions to Him *(SWT)*. Allah *(SWT)* is Wise in His *(SWT)* decisions and He *(SWT)* alone knows all actions of His *(SWT)* servants.

Verse 140

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَاۗءً عَلَي اللّٰهِ ۭ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝

"Those will have lost who killed their children in foolishness without knowledge and prohibited what Allah had provided for them, inventing untruth about Allah. They have gone astray and were not [rightly] guided."

The context of this verse refers to verse 137 of the same Surah. As discussed in the exposition of verse 137, the pagan Arabs used to bury their daughters alive, considering them to be a burden, because females were neither allowed to earn their livelihood nor to own property during the Age of Ignorance *(Jahiliyyah)*. Allah *(SWT)* declares in this verse that those who committed such evil acts are the actual losers who have lost in this life by killing their children and prohibiting food that He *(SWT)* had ordained for them in this earthly existence and that they would be the real losers in the Hereafter, as they will end up in the Hellfire because of the lies that they

attributed to Him *(SWT)*. In this verse, the message of verse 137 has been put plainly to the pagan Arabs that even though such practices had been introduced by their forefathers, religious guides and outstanding leaders, the fact remained that those practices were inherently unsound. That those practices had come down from their ancestors and venerated elders did not necessarily legitimize them. These callous people had introduced such inhuman customs as infanticide, and, without any justification whatsoever, had prohibited to the creatures of Allah *(SWT)* food and drink which He *(SWT)* had created.

Allah *(SWT)* declares in the verse that such a people have indeed gone astray and are not guided on the Right Path. They had also introduced many innovations themselves, making them part of their religion and ascribing them to Allah *(SWT)*. How could such people be considered either to have attained salvation or to be rightly guided? Even though venerated by them as their ancestors, they were nevertheless misguided and were destined to see the evil consequences of their misdeeds.

==========

Verse 141

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّ غَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّ غَيْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ۖ وَلَا تُسْرِفُوْا ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۙ﴿۱۴۱﴾

"And He it is who causes gardens to grow, [both] trellised and untrellised, and palm trees and crops of different [kinds of] food and olives andpomegranates, similar and dissimilar. Eat of [each of] its fruit when it yields and give its due [zakah] on the day of its harvest. And be not excessive. Indeed, He does not like those who commit excess".

In this verse Allah *(SWT)* elucidates the wonders and blessings that He *(SWT)* has bestowed upon His *(SWT)* creatures in the form of the produce that grows in the earth and different kinds of fruit which He *(SWT)* brings forth from it. He *(SWT)* also produces different kinds of vegetation, plants, trees and gardens on the land as a means

of survival for His *(SWT)* creatures. The Arabic expression *"Jannaatim Ma'rushaatin wa Ghaira Ma'rushatin"* signifies two kinds of gardens: first, those consisting of trellised plants and, second, those consisting of trees which stand on their own (untrellised).

The verse also elucidates that there is charity (or Zakat) due at the time of harvesting the crops or picking the fruit, which was usually given to the poor and the needy at that time.

The verse ends by stating that humans ought not to commit excess or waste in any manner, for Allah *(SWT)* does not like those who are spendthrifts.

Verse 142

وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا ؕ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۙ﴿۱۴۲﴾

"And of the grazing livestock are carriers [of burdens] and those [too] small. Eat of what Allah has provided for you and do not follow the footsteps of Satan. Indeed, he is to you a clear enemy.

In this verse, the cattle which are suitable for burden refer to animals like camels and horses and small cattle refer to animals which we use as food like sheep and goat.

Allah *(SWT)* ordains in this verse that humans are allowed to eat from the things that He *(SWT)* has made lawful for His *(SWT)* servants and tells them not to follow the footsteps of the devils who ignore the divine law revealed by Allah *(SWT)* and take their innovated customs and their desires as their religion. The truth is that Satan only wants Allah's *(SWT)* servants to become the dwellers of the Hellfire, thus he invites them to falsehood and misguidance.

The word *"Farasha"* used in this verse (which means 'to spread, to pave, to cover the ground, floor or path') has been used in the context of cattle either:

(1) Because they are relatively short, and in moving about seem to be touching the ground;

(2) Because when they are slaughtered, they have to be laid on the ground; or,

(3) Because their skins and hair are used for furnishing purposes.

It becomes clear from the context of the verse that Allah *(SWT)* wants to emphasize three things. First, that the orchards, fields and cattle are all bounties of Allah *(SWT)*. No one else has made any contribution to them and hence no one is entitled to any share in the thanks that man ought to give Him *(SWT)* in return for these bounties. Second, since all those things are bounties of Allah *(SWT)*, one ought to follow the laws of Allah *(SWT)* alone while making use of them. No one else has the right to regulate their use. To acknowledge oneself bound by customs and practices laid down by others than Allah *(SWT)*, and to make offerings out of a feeling of gratitude for beneficence to someone other than Allah *(SWT)* constitute acts of rebellion and amount to following Satan. Third, as Allah *(SWT)* has created all these things for the fulfilment of man's needs, they should not be unnecessarily suspended from use or be regarded as prohibited. All restrictions on the use of the means of sustenance and other bounties of Allah *(SWT)* based on conjecture or superstition, are not to His *(SWT)* liking at all.

Verse 143

ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ۗ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ۗ نَبِّئُوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

"[They are] eight mates– of the sheep, two and of the goats, two. Say, "Is it the two males He has forbidden or the two females or that which the wombs of the two females contain? Inform me with knowledge, if you shouldbe truthful."

This verse refers to the superstitions of the Arabs mentioned in verse 139 of this Surah, which Allah *(SWT)* has declared as unlawful in this verse. The verse challenges the disbelievers to come forward with arguments based on sound, reliable knowledge, rather than with arguments which have no authority except that of ancestral tradition, conjecture or superstition.

Verses 144

وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ۗ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ

الْاُنْثَيَيْنِ ؕ اَ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۴﴾

"And of the camels, two and of the cattle, two. Say, "Is it the two males He has forbidden or the two females or that which the wombs of the two females contain? Or were you witnesses when Allah charged you with this? Then who is more unjustthan one who invents a lie about Allah to mislead the people by [something] other than knowledge? Indeed, Allah does not guide the wrongdoing people."

This verse refers once again to the superstitions and fabricated customs of the Pagan Arabs. They took the things as lawful which Allah *(SWT)* had made unlawful for them and they made unlawful which He *(SWT)* had permitted for them. In this verse, Allah *(SWT)* mentions various kinds of cattle, male and female, such as sheep, camels, cows and goats and declares that He *(SWT)* did not prohibit any of these cattle or their offspring, rather they were all created as a means of survival and other benefits for His *(SWT)* servants but these unjust people concocted lies against Him *(SWT)*, thus leading other astray from the straight path. Questions as to whether the male offspring is lawful and the female is unlawful are presented in some detail to show how unreasonable their superstitions are. That the male offspring of an animal should be considered lawful for eating while the female be prohibited, or vice versa; and that an animal should itself be considered lawful, but not its offspring, is so manifestly unreasonable that common sense simply refuses to accept it, and no intelligent man can ever conceive such absurdities to have been sanctioned by Allah *(SWT)*. Just as the superstitions in vogue among the Arabs were absurd, as the Qur'an stresses, likewise many other nations of the world follow even now irrational dietary restrictions, and believe that food and drink become polluted merely by the touch of some other people. The verse concludes by a categorical decree of Allah *(SWT)* that indeed He *(SWT)* does not guide the people who are wrongdoers, meaning those who invent lies against Allah *(SWT)* and His *(SWT)* Messenger *(SAAW)*.

==========

And Allah *(SWT)* Knows Best!

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام

بانی: ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

وفاق المدارس سے الحاق شدہ

کلیۃ القرآن (قرآن کالج) لاہور

191۔ اتاترک بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

''تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو خود قرآن سیکھتے ہیں اور دوسروں کو قرآن سکھاتے ہیں۔'' (حدیث نبوی ﷺ)

درس نظامی کے ساتھ ساتھ میٹرک (آرٹس، سائنس)۔ ایف اے۔ بی اے اور ایم اے کے خواہش مند طلبہ کے لیے

آن لائن داخلے شروع

- کرونا وائرس اور لاک ڈاؤن کی وجہ سے لاہور تشریف لائے بغیر بذریعہ واٹس ایپ اپنے کوائف ارسال کریں۔ مطلوبہ قابلیت کا جائزہ لینے کے بعد داخلہ دینے یا نہ دینے کے بارے آپ کو اطلاع کر دی جائے گی۔
- ریگولر کلاسز کے لیے حکومت پاکستان/وفاق المدارس کی ہدایات کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا۔
- کوائف ارسال کرنے کے لیے درج ذیل نمبروں پر رابطہ کریں۔

1۔ مولانا محمد فیاض صاحب 0322-4939102

2۔ شہریار صاحب 0301-4882395

خصوصیات

- دینی تعلیم کے ساتھ عصری تعلیم
- حفاظ، ذہین اور مستحق طلبہ کے لیے مراعات
- وفاق المدارس العربیہ اور لاہور بورڈ/پنجاب یونیورسٹی کا نصاب
- نمایاں پوزیشن والے طلبہ کے لیے وظائف

المعلن حافظ عاطف وحید، مہتمم ریاض اسماعیل، پرنسپل

Quarterly HIKMAT-E-QURAN Lahore
July Sep 2020 Vol. 39 No.

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ــــ اور ــــ سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے ــــ اور ــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ امت مسلمہ کے فہیم عنصر میں تجدیدِ ایمان کی ایک عمومی تحریک پیدا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ ــــ اور ــــ غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ